ماہنامہ

ستمبر 2026ء

# طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا بیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

# یومِ آزادی کی مناسبت سے پروگرام کی تصویری جھلکیاں

## (بزمہائے طلوعِ اسلام لاہور)

مورخہ: 16 اگست 2026ء

پروفیسر ڈاکٹر صالحہ نغمی نظامت کرتے ہوئے

آصف جلیل پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے

حافظ علی وقاص تلاوت کرتے ہوئے

حمیرا فاروقی اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے

سماعت گاہ کے مناظر

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
# طلوعِ اسلام
لاہور
ستمبر 2026ء

جلد 79 | شمارہ نمبر 09

## اس شمارے میں



| عنوان | مصنف | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| لمعات: جنگ ستمبر فسانہ نہیں حقیقت تھی | محمد سلیم اختر | 4 |
| اسلامی حکومت کا سرسری نقشہ | ملک منظور حسین لیل، بھکر | 6 |
| اپنے صحرا میں بہت آہوابھی پوشیدہ ہیں | عنایت اللہ | 15 |
| میرا پیغام | علامہ پرویز علیہ الرحمۃ | 24 |
| قرآنی انقلاب کا راستہ | خورشید انور، فتحپور سوات | 52 |

**ENGLISH SECTION**

| | | |
|---|---|---|
| SALAH | MUHAMMAD SARIM, KARACHI | 60 |



مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 100 روپے فی پرچہ
پاکستان: 1200 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

**Bank Account Idara Tolu-e-Islam**
**National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore**

**For Domestic Transactions**
**Bank A/C No: 0465004073177672**

**For International Transactions**
**IBAN:PK36NBPA0465004073177672**
**Swift Code: NBPAPKKAA02L**

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

# طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

محمد سلیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

# جنگِ ستمبر فسانہ نہیں حقیقت تھی

تاریخ کے سائے جب طویل ہوتے ہیں اور قومیں اپنے معرکوں کے عملی احوال سے دور ہونے لگتی ہیں، تو ان کے پاس دو ہی راستے بچتے ہیں: یا تو وہ اپنے اسلاف کی سرفروشی کو زندہ، تحرک آفریں اور قابلِ تقلید مثال بنا کر اپنے عمل کی بنیاد بنائیں، یا پھر ان خونچکاں حقیقتوں کو ایسے معجزاتی اور افسانوی قصوں میں بدل دیں کہ آنے والی نسلیں عملی جدوجہد سے بے نیاز ہو کر خوابِ خرگوش میں سو جائیں۔ ستمبر 1965ء کا معرکہ صرف جغرافیائی حدود کی حفاظت کا نام نہ تھا، بلکہ یہ اس حقیقت کا تاریخی اعلان تھا کہ جب ایک غیور قوم کی مدافعت کا رشتہ عمل، علم، اور بے لوث قربانی سے جڑ جاتا ہے، تو عددی برتری اور تکبر کے تمام معبد زمین بوس ہو جاتے ہیں۔

ہمارے معرکہ ستمبر کو کسی اچانک رونما ہونے والے معجزے سے تشبیہ دینا ان ہزاروں جانبازوں کی پیشہ ورانہ مہارت، شب و روز کی محنت اور مسلسل تیاری کی کھلی نفی ہے۔ 6 ستمبر کی سپیدہ سحر جب دشمن کے حسد اور انتقام کی آگ سے سرخ ہو رہی تھی، اور جب اس نے کسی اعلانِ جنگ کے بغیر ایک سوئے ہوئے ملک پر اپنے غرور کا بوجھ ڈالنا چاہا، تو اس کے مقابلے میں ایستادہ ہونے والی صفیں محض جذباتی نعروں سے نہیں سجائی گئی تھیں۔ وہ صفیں سالہا سال کی خاموش ریاضت، عسکری ڈسپلن، اور صفتِ رحیمیت کے تحت اندرونی طاقت کو مجتمع کرنے کے تدریجی عمل کا نتیجہ تھیں۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ جھپٹنے والے وہ شیر، سرحدوں پر مفت کی روٹیاں توڑنے والے بے خبر انسان نہیں تھے، بلکہ وہ اس غافل دنیا کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر اپنے جسم و روح کو جہاد کی حتمی تیاری میں ڈھال رہے تھے۔

مگر المیہ دیکھیے کہ جب اس سترہ روزہ جنگ میں دشمن کو ایسی استخوان شکن شکست ہوئی جس کی ٹیسیں ان کی آنے والی نسلیں بھی محسوس کرتی رہیں گی، تو خود ہمارے اپنے فکری اور نظریاتی حلقوں میں ایک عجیب و غریب سازش نے جنم لیا۔ منبر و محراب کے کچھ ان ٹھیکیداروں سے، جو اپنے حلقہ اثر سے باہر کسی واقعی عمل کی پذیرائی برداشت نہیں کر سکتے تھے، یہ برداشت

نہ ہوا کہ خراجِ تحسین اور عقیدت کے نذرانے تسبیح ومصلے سے ہٹ کر مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں۔انہوں نے بڑی صفائی سے ایک افسانوی بیانیہ گھڑا۔ یہ مشہور کیا گیا کہ یہ فتح ہمارے سپاہیوں کی حکمتِ عملی، ان کی شجاعت اور خون کی عطش کا نتیجہ نہیں، بلکہ غیب سے اترنے والی ان نادیدہ ہستیوں کا صدقہ ہے جو سبز عمامے باندھے اور سفید گھوڑیوں پر سوار ہو کر دشمن پر گولے برسا رہی تھیں۔

اس افسانوی ذہنی رو کا سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ جنگ کا تمام تر عملی اور سائنسی کریڈٹ ان سرفروشوں سے چھین کر ایک ایسی مابعد الطبیعیاتی روایت کے سپرد کر دیا گیا جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔قرآنِ کریم نے حیاتِ جاوداں کا مژدہ ان سرفروشوں کو دیا ہے جو خدا کی راہ میں، اپنے وطن کی حفاظت میں جانیں نچھاور کرتے ہیں نہ کہ ان زاہدانِ شب زندہ دار کو جو عمل کے میدان سے فرار اختیار کر کے محض کرامات کے قصے گھڑتے ہیں۔

ذرا یاد کیجیے:

ان بے گناہ اور مظلوم انسانوں کو، جنہیں بھارتی درندوں نے 6 ستمبر کی اس خونی صبح، ان کے بستروں پر اس وقت اپنی خون آشامی کا نشانہ بنایا جب ستارے بھی اس وحشت پر کانپ رہے تھے۔

ان معصوم اور نردوش بچوں کو، جن کی سسکیاں اور جن کے جسموں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا جانا، صرف اس جرم کی پاداش میں تھا کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے تھے۔

ان عزت مآب دخترانِ ملت کو، جن کے آنچل ویرانوں میں گھسیٹے گئے اور جن کی آہ وفغاں کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا سوائے ان غیور جوانوں کے جو اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدان میں اتر آئے۔

چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ اور سلیمانکی کی مٹی کا ایک ایک ذرہ آج بھی اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ قوموں کے نوعروس کا غازہ محض زبانی جمع خرچ سے نہیں، بلکہ شہداء کے خون کی سرخی سے تیار ہوتا ہے۔

آج جب ہم ان کارناموں کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں اپنے اسلاف کے خون کو قصے کہانیوں کی دھند میں گمان نہیں ہونے دینا چاہیے۔قومیں معجزوں کی منتظر رہ کر نہیں، بلکہ عملی تیاری، مسلسل محنت اور سائنسی وعقلی تدابیر کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں۔

لاکھوں سلام اور درود ہوں ان شہدائے امت اور مجاہدینِ ملت پر، جنہوں نے اپنی بے مثال قربانیوں سے اس پاک زمین کو دشمن کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھا، اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ حق کے لیے جان دینے والے جب میدان میں اترتے ہیں، تو وہ تاریخ کا رخ موڑ دیا کرتے ہیں۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

## (قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

## اسلامی حکومت کا سرسری نقشہ

### طلوع اسلام:

نومبر 1980ء، صفحہ نمبر 57: ''(1)۔ قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ''تکریم انسانیت'' ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں احترام اور تکریم کا مستحق ہے۔ اس بنیادی اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم (اور محتاج) بنانے کا حق حاصل نہیں، کیونکہ محکومیت میں شرفِ آدمیت (احترامِ انسانیت) باقی نہیں رہتا۔ قرآن کریم نے اسے بیّن الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔۔۔ (3:79)۔ ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔ خواہ وہ قانون ساز ہو اور خواہ انتظامیہ کا ذمہ دار۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ (اللہ کا محکوم کیسے بنا جائے گا، اسے آیت کے اگلے ٹکڑے میں بتا دیا گیا ہے جسے بعد میں درج کیا جائے گا)۔ (2) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) ''حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔'' وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' (3) لیکن خدا کی ذات تو ہمارے قیاس وگمان و وہم وتصور سے بھی ماوراء ہے۔

### قانون کی حکمرانی:

اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے؟۔ محکومیت تو کسی محسوس اتھارٹی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے اس نے فرما دیا کہ، میری محکومیت، میری کتاب کی اطاعت کی رو سے اختیار کی جا سکتی ہے جو محسوس شکل میں تمہارے پاس موجود ہے۔ کتاب کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی جو اس میں درج ہیں۔ غور فرمائیے! قانون کی حکمرانی (Rule of the law) کا نظریہ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانوں کو دیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: فَاحْكُمْ

بَيۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (5:48)۔ ''ان کے امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرلیا کرو۔'' اوراس کا اعلان (حضور ﷺ کی لسان مبارک سے) ان الفاظ میں کرا دیا کہ: اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ مُفَصَّلًا‌ؕ (6:114)۔ ''کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا ''حاکم'' تسلیم کرلوں حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی ''واضح کتاب'' نازل کردی ہے۔'' اس سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی۔ ہم نے پہلے (آیت نمبر 3:79) میں اس ارشادِ خداوندی کو درج کیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنالے۔ اس کے بعد ہے: وَلٰـكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ۙ (3:79)۔ ''اسے کہنا یہ چاہیئے کہ آؤ! ہم سب مل کر ربّانی بن جائیں اس کتاب کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اوراس پر غور وخوض کے بعد اس کی غایت اور مقصد تک پہنچتے ہو۔'' اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہو۔ نہ کہ کسی انسان کی۔ کفرو اسلام میں یہی حدِ فاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ‏ ﴿۴۴﴾ (5:44)۔ ''جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔''

## قانون سازی:

یہ ہے اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا معیار اور مدار۔ اور دونوں میں تفریق وتمیز۔۔۔ لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں ایسے احکام، جن کی جزئیات بھی اس نے خود ہی متعین کردی ہوں، بہت کم ہیں۔ باقی سب زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اصول واقدار ہیں۔۔ ان کی تفصیلات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جس کتاب کو قیامت تک، اور تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطہء حیات بننا تھا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اصول و اقدار وہ حدود (Boundary Lines) ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی اسلامی مملکت، وہ ضوابط وطریق کار وضع کرتی ہے جن کے مطابق اصول و اقدارِ خداوندی بروئے کار لائے جاسکیں۔۔ یہ اصول واقدار غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا‌ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ‌ ۚ ۔۔۔ (6:115)۔ ''تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کی بنیادوں پر مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔'' لہٰذا، کسی حکومت کو اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ ان حدود میں کسی قسم کی تبدیلی یا حک و اضافہ کرسکے۔۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکمل بھی کردیا ہے اور محفوظ بھی: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ (15:9)۔ ''ہم نے اس کتاب کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' اس لئے اسے کوئی ضائع بھی نہیں کرسکے گا۔۔ جو کچھ اس میں کہا گیا ہے۔

وہ بالکل واضح اور روشن ہے: وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ ۔۔۔ (16:89)۔ ''ہم نے (اے رسول ﷺ) تجھ پر یہ ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنے مندرجات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔'' لہٰذا، وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی تاویلوں اور تعبیروں میں اختلاف ہوگا، وہ قرآنی تعلیم سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔۔ قرآن کی تعلیم واضح اور غیر مبہم ہے۔ اوراس میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ یہ خصوصیت بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ‌ ؕ

وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا (4:82)۔ ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور وتدبر نہیں کرتے؟۔ اگر یہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بکثرت اختلافات اور تضادات پاتے۔'' ۔۔۔۔۔ یہ ہیں وہ حدود جنہیں محفوظ رکھنا، اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا۔ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ (9:112) مومنین کی خصوصیت بتائی گئی۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی مملکت میں کسی کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس میں امت کا فریضہ حدود اللہ کی نگہداشت اور محافظت ہوتا ہے ، اور اربابِ حل وعقد کا فریضہ، احکام واصول واقدارِ خداوندی کے اجراء اور تنفیذ کے لئے طور طریق وضع کرنا۔ انہیں آپ جزئی یا فرعی قوانین ۔۔(Bye laws) کہہ لیجئے۔ وہ یہ فریضہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیں گے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے جزئی اور فرعی قوانین میں سے کوئی بھی ان اصول واقدار سے ٹکرائے گا نہیں۔ انہی کی روشنی میں اس حکومت کا داخلی نظم ونسق بھی برقرار رکھا جائے گا اور بیرونی تعلقات کی پالیسی بھی مرتب کی جائے گی۔۔ قرآن کریم ایسی جامع کتاب ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جس کے لئے اس میں اصولی راہنمائی موجود نہ ہو۔۔ اس لئے اس حکومت کو، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت کے سرانجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ حکومت کے وضع کردہ یہ فرعی قوانین زمانے کے حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے لیکن وہ حدود اپنی جگہ مستقل اور غیر متبدل رہیں گی۔ ثبات اور تغیر کے اس حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہے گا۔۔۔۔ قرآن کریم کی رو سے، مملکت کسی خاص گروہ یا جماعت کی وراثت یا ملکیت نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری امت کو ملتی ہے۔ کیونکہ انہی کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے (24:55)۔۔۔ اس لئے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت، اُمت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔۔ اس مشاورت کا سب سے پہلے حکم خود حضور نبی اکرم ﷺ کو دیا گیا (3:158)۔ اور جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ: وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38)۔ ''ان کی مملکت کے امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔''

## قرآنی مشاورت:

قرآن کریم نے مشاورت کا اصول دیا ہے جو غیر متبدل ہے۔ اس مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ بہ تقاضائے حالات، جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے وضع کرلے۔ ہمارے ہاں کے دانشور حضرات جو یہ تحقیق کرنے کے لئے خواہ مخواہ مغز کھپا رہے ہیں کہ اسلام کی رو سے انتخابات کس طرح ہوں گے۔ ووٹرز کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ مجلسِ قانون ساز کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ مرکز مضبوط ہوگا یا صوبجاتی خود مختاری ہوگی۔ یہ بے معنی بحثیں ہیں۔ ان امور کو اسلامی مملکت، خود اپنے حالات کے تحت طے کرے گی۔ جو طریق بھی وہ مناسب سمجھے وہ ''اسلامی'' ہوگا۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی اصول (حدود اللہ) سے نہ ٹکرائے۔ مغربی جمہوریت اس لئے خلافِ اسلام ہے کہ اس میں قانون سازی کے غیر محدود اختیارات انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں، جو قرآن کی رو سے شرک ہے۔۔ قرآنی مشاورت اس لئے اسلامی ہوگی کہ اس میں جملہ امورِ مملکت پر حدود اللہ کا کنٹرول ہوگا۔۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ زندگی، اور

اسلامی مشاورت اور مغربی جمہوریت میں ۔۔۔اب آیئے سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کے وجود کی طرف۔

## اقوامِ عالم کی نگران اُمّت:

قرآن کریم کا منتہائے نگاہ، تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منسوط کرنا ہے۔آغازِ کار کے لئے اس نے ایک امت کی تشکیل کی۔جس نے نسل، رنگ، زبان، وطن، مذہب وغیرہ کے اختلافات کو ختم کر کے صرف ایمان (آئیڈیالوجی) کی بنیادوں پر ایک برادری کی شکل اختیار کی۔ارشادِ خداوندی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143)۔۔''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا۔تمہارا نظام یہ ہوگا کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو اور تمہارا رسول ﷺ تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہو۔''اس امت کے متعلق دوسرے مقام پر ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3: 110)۔''تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان امور کو نافذ کرو جنہیں ضابطہء خداوندی جائز قرار دیتا ہے اور ان امور پر پابندی عائد کرو جنہیں وہ معیوب ٹھہراتا ہے۔''

## تفرقہ:

اس امت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103)۔''تم، تمام کے تمام، اجتماعی طور پر، وحیء خداوندی (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو''۔۔یعنی تشکیلِ امت کے بعد، پہلی چیز جس کی انہیں وارننگ دی گئی، یہ تھی کہ وہ تفرقہ پیدا نہ کریں۔فرقوں اور پارٹیوں میں نہ بٹ جائیں۔۔۔اس نے فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے کو مشرکین کا شیوہ بتایا جب کہا کہ: ولا تکونوا من المشرکین۔من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون (32-31:24)۔''دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور اس طرح فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔پھر ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ (حزب) اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں، اور باقی سب باطل پر''۔۔یہاں اس نے امت میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک قرار دیا ہے۔۔دوسری جگہ اسے کفر اور عذابِ عظیم کا موجب بتایا ہے۔فرمایا: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (3:105)۔''اے جماعتِ مومنین! دیکھنا! کہ تم بھی کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے واضح تعلیم خداوندی کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہوگا۔''آخر میں کہا کہ: اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106)۔''کیا تم ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کرلو گے۔''یعنی ایمان کی مظہر تو وحدتِ امت تھی۔وہ وحدت نہ رہے تو ایمان باقی نہیں رہتا، کفر آجاتا ہے۔اس نے حضور نبی اکرم ﷺ سے فرما دیا کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (6:159)۔۔ ’’جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کردیں اور خود ایک پارٹی بن جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔‘‘۔۔۔ہم پوچھتے ہیں اربابِ علم وبصیرت سے کہ کیا قرآن کریم کے ایسے واضح اور بیّن ارشادات کے بعد، ایسا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ، نظام یا حکومت میں، فرقوں اور پارٹیوں کی گنجائش ہے۔۔۔؟

## تعمیرِ مسجد:

فرقہ بندی اور اسلام کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں، قرآن کریم نے اس کی وضاحت ایک عملی مثال سے بھی کردی۔ مدینہ میں بعض لوگوں نے ایک مسجد تعمیر کی۔۔۔۔ مسجد کا تعمیر کرنا اجرِ عظیم کا مستوجب قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو کفر قرار دیا۔ اس مسجد کو جہنم سے تعبیر کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ تم اس میں قدم تک نہ رکھنا!۔ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک مسجد اور اس کی تعمیر اس قدر غضبِ خداوندی کا موجب بن گئی؟۔ وہ بات یہ تھی کہ وہ مسجد وَّتَفۡرِيۡقًا ۢ بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (9:107)۔ ’’اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی۔‘‘ اس لئے کہا کہ وہ مسجد نہیں: وَاِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ مِنۡ قَبۡلُ ؕ (9:107)۔ ’’خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی کمین گاہ تھی۔‘‘۔۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کی ایسی واضح تنبیہات کے علی الرغم اگر کوئی سمجھتا ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں کی موجودگی میں بھی کوئی معاشرہ یا نظامِ حکومت اسلامی کہلا سکتا ہے تو اس سے ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟۔۔ عابد صاحب (صاحبِ استفسار) کے ذہن میں کچھ ایسا نقشہ ہے کہ صدرِ اوّل میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس کے ایوانِ پارلیمان میں ایک طرف (حضرت) ابوبکرؓ اور عمرؓ مسندِ اقتدار پر متمکن تھے اور ان کے بالمقابل (حضرت) عثمانؓ اور علیؓ (معاذ اللہ) حزبِ اختلاف کی بنچوں پر براجمان۔ اور ان دو پارٹیوں (احزاب) میں وہ کچھ ہوتا تھا جو دنیا کے ایواناتِ پارلیمان میں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اُس میں یہ نقشہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے دو احزاب ہی کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حِزۡبَ اللّٰهِ اور حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ (58:19-22)۔ حزب اللہ ایک ہی پارٹی (امتِ واحدہ) تھی۔ یہ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ (48:29) کی پارٹی تھی۔ اور حزبِ مخالف، ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ حزب اللہ کے اندر مختلف احزاب (پارٹیوں) کا تو وہاں تصور تک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔۔۔ اسلام میں حکومت، (یعنی خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی) پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی مجلسِ مشاورت (پارلیمان) بھی امتِ واحدہ ہوتی ہے۔

## قرآن، سب کا آئین:

قرآن مجید ان سب کا آئین ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔ زیرِ نظر معاملہ پر قرآن کی روشنی میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اپنی اپنی آراء کا بلاخوف وخطر اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ قانونِ شریعت کی

شکل میں اُمت پر نافذ ہوجاتا ہے۔۔اس میں ''اربابِ حکومت'' اورعوام میں کوئی تفریق نہیں ہوتی، اس قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔اس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔۔یہ تفریق سیکولر نظامِ حکومت کی پیدا کردہ ہے۔چونکہ امت میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا اس لئے'' مختلف فرقوں کی اپنی اپنی فقہ'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مرکزی حکومت، انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر، ملک کو مختلف قطعات میں تقسیم کر سکتی ہے۔۔مرکز کے نمائندگان جو ان علاقوں میں قوانینِ شریعت کی تنفیذ کے فرائض سرانجام دیں گے، انہیں قرآن کریم میں ''اولی الامر'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔۔وہاں کے لوگوں کو ان ''اولی الامر'' (افسرانِ ماتحت) سے اختلاف ونزاع کا حق حاصل ہوگا، اوراس کے تصفیہ کے لئے معاملہ زیرِ نظر کو مرکزی حکومت کی طرف (Refer) کیا جائے گا۔مرکز اس کا فیصلہ قرآن کریم کی روشنی میں کرے گا۔ارشادِ خداوندی ہے:
وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ؕ (42:10)۔''اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کی رو سے کیا جائے گا۔''

## قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟:

طلوعِ اسلام جنوری 1970ء،ص:71''طلوعِ اسلام جس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اس میں:

(1) ہر شخص کی عزت، بلاتمیز مذہب، رنگ، نسل، پیشہ محض انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔اس کا کیریکٹر کیسا ہے اور وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے؟۔

(2) کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یارو مددگار نہیں ہوگا۔ ہرایک کی بات سنی جائے گی۔اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔کوئی صاحبِ اثر، انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

(3) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان وغیرہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(4) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم وتربیت اور (بوقتِ ضرورت) علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا معاوضہ انتظام کرے۔تعلیم وتربیت کا منشاء حصولِ علم کے علاوہ، فرد کی ذات کا استحکام اوراس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔''فرد'' میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور سفرِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے قابل۔

(5) ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے گا۔صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوگئے ہوں۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہوجائیں اور کچھ لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(6) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔باقی سب حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دے گا۔اور عندالضرورت

دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔ یہ سب کچھ قرآنی نظام کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

(7) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) امت کی تحویل میں رہیں گے۔ تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ قرآنی نظام انہیں نظم ونسق کی خاطر، بطور امانت افراد کے سپرد کر دے گا۔ جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(8) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق۔ (اس میں گروہوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا) اس لئے اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد۔ نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(9) ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا۔ اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(10) یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے اٹل ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی انہی بنیادوں پر ہوگا۔

(11) اس معاشرہ میں نظامِ حکومت، کمیونزم کی ڈکٹیٹر شپ یا مغرب کی لادینی جمہوریت یا تھیاکریسی کی بجائے خالص قرآنی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا۔''

## نہ خوف نہ حزن:

طلوعِ اسلام مارچ 1970ء، ص:18 ''قرآن نے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن (2:38)۔ خوف، خارجی خطرات سے ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا، قرآنی مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ مملکت میں ایسی فضا پیدا کر دے جس میں کسی شریف انسان کو نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہو، نہ حزن گلوگیر۔ اسے نہ کسی سے کوئی ڈر ہو اور نہ ہی کوئی پریشانی۔۔۔ ڈر ہو تو صرف قانون کی خلاف ورزی کے نتائج کا۔ اور پریشانی ہو تو اس وقت جب اس نے کسی مستقل قدر (Permanent Value) کو پامال کر کے، اپنی ذات کو اپنے ہاتھوں نقصان پہنچایا ہو۔''

طلوعِ اسلام فروری 1972ء، ص:44 ''وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا، چکی کے پاٹ تھے۔۔ یعنی روٹی کی فکر۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، اس محبوسِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا۔ جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی

خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے،اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا،صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔۔۔بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔۔۔باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ ءسوہانِ روح ہوتا ہے۔۔سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکا یک سواری کو روکا، نیچے اترے،اور سجدے میں گر گئے۔رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا،اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ایک وہ دن تھا،اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔۔یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔۔۔یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔اس میں،خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔۔خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔۔۔باقی رہا ''حزن''۔تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہناکی ہوتے ہیں۔خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے،جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔سورہ ءفاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ:۔۔۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔عربی زبان کے مستند لغت ''تاج العروس'' میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: اِلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ۝ (35:34-35) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے،نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی۔نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی ، یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات و حسنات۔''

انسانیت کے لئے نفع بخش:

طلوع اسلام جنوری 1983ء، صفحہ نمبر 62: ''جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے آیہء رحمت ہوتی ہے۔ اور جب دین سے الگ ہوجائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کا راز، اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ: ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (12:17)۔ ''بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو،'' کسی خاص جماعت۔ خاص پارٹی۔ خاص گروہ۔ خاص ملک۔ خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش۔ حتیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل وانصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل میں اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ (5:8)۔ ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔'' پروفیسر (J.D.Mabbot) نے کہا تھا کہ:۔ اچھی حکومت اسے کہنا چاہیئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ باہمی معاملات میں خوشگواری ہو۔ اور افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جاسکیں۔ (بحوالہ: The State and the Citizens)۔ قرآنی تصور کے مطابق قائم شدہ مملکت، ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے جس کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ذہنِ انسانی کے تجویز کردہ نظامِ حکومت اور وحی کے خطوط پر متشکل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے۔۔ وہی فرق جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ۔

مملکت لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0318-2221851 Phone: 042-35714546

عنایت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ 6 ستمبر 1965ء

# اپنے صحرا میں بہت آہوا بھی پوشیدہ ہیں

(ماخوذ طلوعِ اسلام ستمبر 1967ء)

عنایت اللہ صاحب، حلقہ طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے متعارف ہیں لیکن 1965ء کی جنگ کے بعد انہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی تھی انہوں نے جہادِ پاکستان کے غازیوں اور شہیدوں کی یاد کے چراغ، اپنے خونِ جگر کے روغن سے مسلسل جلائے رکھے ۔وہ چھاؤنی چھاؤنی، نگر نگر اور بستی بستی پھرے تاکہ تاریخ پاکستان کے اس محیر العقول معرکہ کے عینی شاہدوں سے واقعات سنیں اور اکٹھے کریں۔ اس طرح انہوں نے چمن میں بکھری ہوئی اس داستان کی ایک ایک پتی کو اپنی مژگانِ عقیدت سے جمع کیا۔ انہی میں سے چند شگفتہ وشاداب پتیاں وہ بزمِ طلوع اسلام میں بھی لے کر آئے جنہیں ایک بار پھر ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ہفت روزہ ''ٹائم'' کے وقائع نگار، لوئیس کرار، نے جنگِ ستمبر کے دوران میں سیالکوٹ سیکٹر کے جھلسے ہوئے، میلوں وسیع، کھیتوں میں بھارت کی بکتر بند قوت کے جلے ہوئے پرخچے (جنہیں بھارتی ٹینک کہا کرتے تھے) اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اُس نے اِس سیکٹر کے پاکستانی کمانڈر سے حیرت زدہ ہوکر پوچھا ___ ''آپ نے اس قدر تھوڑی سی طاقت سے بھارت کی اس قدر زیادہ قوت کو کسی طرح شکست دے لی ہے؟''

ہمارے جری کمانڈر نے فاتحانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔'' اگر حوصلہ اور جذبہ روپے پیسے سے خریدا جاسکتا تو بھارت کے جنگ پسند حکمران یقیناً یہ دونوں چیزیں بھی امریکی امداد میں حاصل کرلیتے۔''

ہمارے فاتح سالار کا یہ جواب اپنی جگہ مکمل ہے___ حوصلہ اور جذبہ___ اس جواب نے یہودی ہفت روزہ ''ٹائم'' کے امریکی جنگی وقائع نگار کو مطمئن کردیا تھا، لیکن تاریخ مطمئن نہیں۔ تاریخ تفصیلات پوچھ رہی ہے کیونکہ جنگِ ستمبر میں ذاتی حوصلے، جذبے اور حب الوطنی

کے کچھ ایسے مظاہرے ہوئے ہیں جنہیں تاریخ اپنی جھولی میں ڈالتے سے لرز رہی ہے، کہ اسے اس متاعِ عظیم کی وسعت اور اپنی تنگ دامانی کا پورا پورا احساس ہے۔

یہ سوال کہ اس قدر تھوڑی طاقت نے اتنی زیادہ قوت کو کس طرح شکست دے لی ہے؟ لوئیس کرار نے نہیں، تاریخ نے پوچھا ہے۔ تاریخ نے یہ سوال صدیوں پہلے بدر کے میدان میں بھی پوچھا تھا۔ تاریخ بدر کے میدان میں بھی لرز اٹھی تھی اور صدیوں بعد تاریخ نے ایک بار پھر لاہور اور سیالکوٹ کے میدانوں میں اپنے سینے میں وہی لرزہ محسوس کیا ہے۔ لیکن اب کے یہ لرزہ نہیں، بھونچال کا شدید جھٹکا تھا جس نے عالمی جنگوں کی تاریخ کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا ہے کیونکہ اُس نے پاک فوج کی پنجاب رجمنٹ کے نائک غلام احمد کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ آیئے، اسی غازی کا کارنامہ سن لیجئے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اپنے اگلے دستے بی آر بی کے اگلے کنارے سے ہٹ کر ورلے کنارے پر مورچہ بند ہوئے تو بٹالین کمانڈروں، بریگیڈ کمانڈروں اور خود ڈویژن کمانڈر نے بھی محسوس کیا کہ اپنے سپاہی دفاع پر نہیں لڑنا چاہتے، وہ بڑھ کر دشمن پر وار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نفری بہت تھوڑی تھی۔ تین چار پیادہ پلٹنیں اور ایک ٹینک یونٹ کوئی نفری نہیں ہوتی۔ اس ذرا جتنی نفری کا سامنا بھارت کے پورے ڈویژن (نمبر 15) سے تھا جسے نہ صرف طیاروں کی بلکہ اڑھائی سو سے زیادہ توپوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس ڈویژن کو بھارت کے نامور چھاتہ بردار نمبر پچاس بریگیڈ کی کمک مہیا کی گئی تھی اور اس سے پیچھے، امرتسر کے گردونواح میں، نمبر 23 مونٹین ڈویژن (جسے بھارتیوں نے چین کے بہانے امریکہ سے تیار کرایا تھا) پا بر کاب تھا۔ جنرل چوہدری کا یہ اعلان کہ وہ نو بجے تک لاہور پر قابض ہو چکا ہوگا، مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس اُس کے لشکر کی اچانک یلغار کو روکنے کے لئے کچھ نہیں۔ ہوا بھی یوں ہی کہ پاک فوج نے ڈوگرئی سے راوی سائیفن (مقبول پورہ) تک کے تمام اگلے دستوں کو پیچھے ہٹالیا تھا اور دشمن بی آر بی تک تقریباً آن پہنچا تھا۔ لیکن پاک فوج کے ان مٹھی بھر دستوں کے مورچوں سے نعرۂ تکبیر کے ساتھ دو اور نعرے گونجے ــــ ''پاکستانیو! یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔'' ــــ اور دوسرا نعرہ تھا ــــ ''پاکستانیو! دلی پہنچو۔'' ــــ اور ایک تیسرا نعرہ بھی گونجا جو کئی بار سنائی دیا ــــ ''پاکستانیو! آج بے غیرت نہ ہو جانا۔ شاستری کے گھر تک پہنچو۔''

جس طرح جنرل چوہدری نے اپنی نفری کو دیکھ کر جنگ کی اسکیم بنائی تھی اگر اسی طرح ہمارے کمانڈر اپنی صرف نفری کو پیش نظر رکھتے تو ان کے سامنے ایک ہی جنگی چال تھی کہ لاہور سے بھی پیچھے ہٹ کر راوی کے شاہدرے والے کنارے مورچہ بند ہوتے لیکن انہوں نے جب اپنے سپاہیوں کا غیظ وغضب اور بے پناہ جذبہ دیکھا تو بریگیڈیئر آفتاب احمد نے ڈویژن کمانڈر کو خود اعتمادی سے کہا ــــ ''جناب! ہم دشمن پر جوابی حملہ کرسکتے ہیں۔'' ــــ چنانچہ لاہور کی دہلیز پر وہی فیصلہ ایک بار پھر کیا گیا جو صدیوں پہلے بدر کے میدان میں کیا گیا تھا اور جسے صلاح الدین ایوبی نے کئی بار دہرایا تھا۔ یہ وہی فیصلہ تھا جو ایوبی کے پوتے الکمال کی بیوی شجرۃ الدّر نے منصور کے میدان میں صلیبیوں کے خلاف

کیا تھا۔(الکمال شہید ہوگیا تو اس کی بیوی نے فوجوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ دوسری طرف صورت یہ تھی کہ سارا یورپ مسلمانوں سے فیصلہ کن معرکہ لڑنے کے لئے امڈ آیا تھا۔شجرۃ الدرّ نے پہلا حکم یہ دیا تھا کہ کسی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ سالارِ اعظم الکمال شہید ہوگیا ہے۔ باقی داستان بہت طویل ہے۔

بدر کا فیصلہ جب لاہور کے میدان میں دہرایا گیا تو اپنی صرف دو کمپنیاں جن کی نفری تین سو تیرہ ہی کے لگ بھگ تھی، چھ ستمبر کی بھیانک رات کی تیرگی میں راوی سائیفن کی راہ بی آر بی سے پار چلی گئیں اور دشمن کی چار پلٹنوں (ہر پلٹن کی نفری ایک ہزار) پر ٹوٹ پڑیں اور دشمن کی چار ہزار نفری کو دھکیلتی، لہولہان کرتی اپنی سرحد سے نکل کر بھارت کی رانی اور طوطی کی چوکیوں پر قابض ہوگئیں ___ تاریخ اسلام کے لئے یہ معرکہ کوئی انوکھا نہیں لیکن عالمی جنگوں کی تاریخ سوچ میں بیٹھی ہے، سر جھکائے ہوئے!

میں ایک طویل داستان کو بے دردی سے سمیٹتا چلا جا رہا ہوں لیکن مجبور ہوں کیونکہ یہ ضخیم کتابوں کا (ایک کتاب کا نہیں کئی کتابوں کا) موضوع ہے۔ ہماری دو کمپنیوں نے بی آر بی سے پار ڈوگرئی سے ڈیڑھ میل آگے (واہگہ روڈ کے تیرہویں اور چودہویں سنگِ میل کے درمیانی علاقہ میں) جا مورچے کھودے پہلے روز ان کمپنیوں کی نفری تین سو چھبیس (326) تھی اور فائر بندی کے وقت وہ کل پچاس رہ گئے تھے۔ یہ مورچے لاہور کی قربان گاہ تھی جہاں یہ جانباز لہولہان ہوتے رہے، شہید ہوتے رہے، کٹتے رہے، مگر گرجتے رہے ___ ان میں بیشتر کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں کیوں کہ دشمن لاشوں کو پیچھے لانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ انہیں ان کے ساتھی وہیں کہیں (بعض کو مورچوں میں ہی) دفن کرتے رہے۔ پھر خود بھی شہید ہو گئے اور مٹی کی ان ڈھیریوں پر ٹینک پھر گئے۔ اب ان پر کھیتیوں کی ہریالی جھوم رہی ہے۔ گندم کے کسی خوشے کو سونگھ کے دیکھو، اس میں سے تازہ لہو کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔

ہاں تو، میں نائک غلام احمد کی بات کر رہا تھا۔ وہ انہی مورچوں میں تھا۔ میں اس سرفروش غازی کو علامت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ ذرا دیکھئے کہ خالی وردی میں لپٹے ہوئے ہمارے یہ گمنام سے اَن پڑھ دیہاتی کس طرح موت کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے رہے ہیں۔ غلام احمد ٹینک شکن گن (آر آر) کا گنر تھا۔ یہ گن جیپ پر نصب ہوتی ہے اور زمین پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔ ایک روز دشمن کے بہت سے ٹینک واہگہ سے ذرا اس طرف شمال سے جنوب کی طرف ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پار کر رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ لاہور پر ایک اور حملہ کرنے کے لئے بکتر بند قوت کہیں مرکوز کر رہا ہے۔ ڈوگرئی کے اگلے مورچوں کے پیادہ سپاہی ان ٹینکوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتے تھے۔ ٹینک سے ٹینک یا طیارہ لڑا کرتا ہے۔ لیکن نائک غلام احمد نے اپنے کمپنی کمانڈر سے کہا ___ ''جناب! ایک تماشہ کروں؟'' ___ ذرا غور فرمایئے، اُس نے ''تماشے'' کا لفظ استعمال کیا تھا ___ اور کس وقت کیا تھا؟

اس کے کمپنی کمانڈر نے مجھے بتایا کہ میں ہنس پڑا اور کہہ دیا ___ ''ہاں غلام احمد، کرو تماشہ، مرنے سے پہلے تماشہ ہی دیکھ لیں'' ___ کمپنی کمانڈر بتاتا ہے کہ میں اسے محض

مذاق سمجھ رہا تھا اور مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ غلام احمد سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا تو غلام احمد بھاگ کر اپنی آر آر کی جیپ پر جا بیٹھا اور جیپ کو ڈھکی چھپی پوزیشن سے نکال کر کھلی سڑک پر لے گیا۔ وہاں سے اُس نے جیپ کو واہگہ کی سمت (جہاں سے دشمن کے ٹینک گزر رہے تھے) انتہائی تیز رفتار پر چھوڑ دیا۔ ہم دم بخود کہ یہ شخص خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ سامنے دشمن کے ٹینک، اِدھر یہ اکیلا اور وہ بھی کھلی سڑک پر مگر وہ دُور نکل گیا تھا، اُسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

لیکن نائک غلام احمد ''تماشہ'' دکھانے گیا تھا۔ اُدھر ایک اور ٹینک سڑک پر چڑھا، اِدھر غلام احمد نے جیپ کی اسی تیز رفتار سے ایک گولہ فائر کیا۔ دشمن کا ٹینک کئی فٹ اوپر اچھلا اور آگ کا مہیب شعلہ بن گیا۔ دوسرا ٹینک سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ابھی کھیتوں میں تھا۔ غلام احمد نے اسی رفتار پر جیپ کو ذرا گھمایا اور دوسرا گولہ فائر کر دیا۔ دشمن کا وہ ٹینک زخمی بھینسے کی طرح چکرایا اور ساکن ہو گیا۔ غلام احمد نے جیپ روک لی اور اُلٹے گیئر میں ڈال دی، کیونکہ باقی ٹینکوں نے اپنی گنوں کا رُخ اس طرف کر لیا تھا۔ نائک غلام احمد کی جیپ کھلی سڑک پر ان کے سامنے تھی۔ بیک وقت دو تین گولے غلام احمد کی جیپ کے سامنے آ کر پھٹے۔ جیپ کا انجن صاف اُڑ گیا اور غلام احمد زخمی ہو گیا۔ لیکن اُس نے جیپ سے گن الگ کر لی۔ اس دوران اس کے اردگرد گولے پھٹتے رہے اور اس کا خون تیزی سے بہتا رہا۔ لیکن وہ گن کو قریب ہی زمین پر آڑ میں لے گیا اور فائر کرتے کرتے رینگ رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ آخر وہ جسم کا آدھا خون بہا کر مورچے میں واپس آ گیا۔ کمپنی کمانڈر نے آتے ہی سینے سے لگا لیا۔ اور کہا___ ''بیوقوف! تم مرنے گئے تھے؟''___ غلام احمد نے ہنس کر کہا___ ''نہیں جناب! میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ تماشہ کرنے جا رہا ہوں؟''___ اور جب اُسے ہسپتال بھیجا جانے لگا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ''یہ تو معمولی زخم ہیں۔''___ اُس نے ان گہرے زخموں کو اپنی فیلڈ پٹی سے چُھپا لیا۔ فائر بندی تک اُس نے اسی طرح کئی اور ٹینک تباہ کئے تھے۔

اور اسی طرح کا ایک اور حوالدار انہی مورچوں میں تھا۔ فائر بندی سے ایک روز پہلے دشمن ان اگلے مورچوں کو کچلنے کے لئے بے شمار نفری سے حملہ آور ہوا اور اس قدر قریب آ گیا کہ گرنیڈوں کی جنگ شروع ہو گئی اس حوالدار کا بایاں بازو کہنی کے قریب سے کٹ گیا۔ اسی ہاتھ سے وہ گرنیڈوں کے پن نکالتا تھا۔ وہ ہاتھ ہی جسم سے الگ ہو گیا۔ اس جانباز نے پروا نہ کی اور دانتوں سے پن نکال کر گرنیڈ پھینکتا رہا۔ کٹے ہوئے بازو سے خون فوارے کی طرح بہتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ خون بہنے سے بے ہوش ہو گیا۔

ذکر جب انفرادی شجاعت کا آ جاتا ہے تو بات کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ صرف ایک کارنامہ اور سن لیجئے۔ عبدالمتین شہید بنگالی تھا۔ وہ پاک فوج کی ایک ٹینک رجمنٹ کا گنر (توپچی) تھا۔ اُس کے ٹینک کو گولہ لگا اور ٹینک جلنے لگا۔ اُس کے ساتھ ایک دفعدار اور دو اور کریئو (Crew) تھے۔ سب ٹینک سے کود آئے لیکن ٹینک کی توپ ابھی محفوظ تھی اور عبدالمتین شعلوں کی لپیٹ میں گولے فائر کر رہا تھا۔ دفعدار نے چلا کر کہا۔ ''متین! کود آؤ، ایمونیشن پھٹنے والا

ہے۔'' متین شہید جانتا تھا کہ اُس کے ٹینک میں ایمونیشن رکھا ہے جو دوسرے ہی لمحے پھٹے گا۔ لیکن اُس نے چیخ کر جواب دیا___ ''دشمن رینج (Range) میں ہے۔'' اور اس نے نہایت تحمل سے دشمن کے دو ٹینک تباہ کر ڈالے۔ مگر اُس کا ایمونیشن ہولناک دھماکے سے پھٹ گیا___ عبدالمتین شہید کی قبر کہاں ہے؟___ ہمارے سینوں میں! اُس کی لاش کا تو نشان بھی نہیں رہا تھا۔

میں نے یہ تین مثالیں پاک افواج کے بنیادی جذبے کی علامت کے طور پر پیش کی ہیں۔ ان مثالوں کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے بھارت کے اکیس (21) ڈویژنوں کو سات ڈویژنوں سے روکا تھا۔ یہاں میں ایک بات واضح کردوں__ ڈویژنوں کے حساب سے ہماری فوج انڈین آرمی کا تیسرا حصہ تھی۔ لیکن بھارت کے ڈویژن کی نفری پاک فوج کے ڈویژن کی نفری سے ڈیڑھ پونے دوگنا زیادہ ہوتی ہے اس حساب سے پاک فوج کی نفری انڈین آرمی کا چھٹا حصہ تھی لیکن بعض محاذوں پر ہمارے ایک سپاہی کا مقابلہ دس بھارتی سپاہیوں سے اور ایک ٹینک کا مقابلہ بارہ سے سولہ ٹینکوں تک تھا۔

اس فوقیت کے علاوہ انڈین آرمی نے اچانک حملہ کر کے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کر دیا تھا میدانِ جنگ میں اُس فوج کی فتح یقینی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت سے رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں حریف کو بیدار کئے بغیر اچانک حملہ کردے اور اُسے مورچہ بند ہونے کی مہلت نہ دے اور اُسے کوئی چال سوچنے یعنی Initiative سے محروم کردے۔ پہلے روز انڈین آرمی نے پاک فوج کو اِسی ہولناک پوزیشن میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کے ففتھ کالم نے پاکستان کے شہریوں خصوصاً لاہور والوں کا حوصلہ اور پاک فوج پر اعتماد توڑنے کے لئے دو کاری ضربیں لگائیں۔ ایک یہ کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے اعلان کرادیا کہ انڈین آرمی لاہور پر قابض ہوگئی ہے اور دوسری افواہ یہ پھیلائی کہ ''لاہور کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل سرفراز کو گولی ماردی گئی ہے کیونکہ جب حملہ ہوا تو وہ شراب میں بدمست پڑا تھا۔'' (حالانکہ جنرل سرفراز کو لاہور کے کامیاب دفاع کے صلے میں ہلالِ جرأت دیا گیا)۔ مقصد اس سے یہی تھا کہ فوج کی دیوار کے پیچھے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے والے شہری محسوس کرلیں کہ ان کی وہ حفاظتی دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔

جنگ کا کوئی بھی ماہر اور مبصر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ پاک فوج کے مختصر سے دستے انڈین آرمی کی یلغار کو روک لیں گے۔ قوت کی زیادتی کے علاوہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنرل چوہدری نے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کر دیا ہے لیکن یہ ماہرین اور مبصر آج بھی سوچ رہے ہیں کہ پاک فوج نے یہ معجزہ کس طرح کر دکھایا؟

جب پاک فوج نے بھارت کے جنگ پسندوں کو لاہور کی دہلیز پر روک لیا اور بھارتیوں کی لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ تو بھارت کے چوہدری نے دوسری چال چلی۔ اُس نے محاذ کو پھیلانا شروع کردیا اور محاذ ایک ہزار میل تک پھیل گیا۔ انڈین آرمی پاکستان کی دفاعی لائن میں شگاف ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ قوت کے زور سے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر اُس نے پاک فوج کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر

پھیلا کر مقصد پا لیا۔ کیونکہ پاک فوج کی نفری اس قدر طویل محاذ کے لئے تھوڑی تھی۔ چنانچہ دفاعی لائن میں از خود شگاف پیدا ہو گئے۔ ہمارا دفاع جو پہلے روز ایک موٹے رسے کی طرح مضبوط تھا، کھنچتے کھنچتے کچا دھاگہ بن گیا۔ پاکستان کا مستقبل اب اس کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا۔

دفاع کی مضبوطی کو اس کی گہرائی سے ناپا جاتا ہے۔ اگلے مورچے، پچھلے مورچے اور اس سے پیچھے کمک سپلائی کا نظام۔ مثلاً دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تھا تو روس کے دفاع کی گہرائی ایک سو پچاس میل تھی۔ لیکن جرمن فوجوں نے محاذ کو پھیلا کر روسیوں کے دفاع کی دوسری اور تیسری تہہ کو بھی اگلے مورچوں پر آجانے پر مجبور کر دیا تھا اور دفاعی گہرائی ختم کر کے جرمن فوجیں ماسکو تک جا پہنچیں تھیں یہی چال چوہدری نے چلی۔

جنرل چوہدری نے پاکستان کو فتح کرنے کی جو سکیم بنائی تھی وہ کسی پہلو بے عیب نہیں تھی۔ میں اس کی ایک چال کی داد دیتا ہوں کہ اُس نے پاکستان کے ٹینکوں کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر پھیل جانے پر مجبور کر دیا اور اپنے ٹینکوں (نمبر 1 آرمرڈ ڈویژن جس میں دو ٹینک رجمنٹیں، نمبر 62 کیولری اور 2 لانسرز اضافی تھیں) کو ایک جگہ مرکوز کر لیا اور سیالکوٹ سیکٹر پر جنگوں کی تاریخ کا شدید ترین بکتر بند حملہ کر دیا۔ اس بکتر بند قوت کے ساتھ اس کے انفنٹری (نمبر 26، نمبر 14) اور ایک مونٹین ڈویژن، نمبر 6 (جس میں جنگ سے چند دن پہلے تک امریکی افسر موجود تھے) بھی تھے۔ جب اس ہیبت ناک قوت نے سیالکوٹ پر یلغار کی تو پاک فوج کو کئی محاذوں سے ٹینک نکال کر سیالکوٹ کے دفاع کے لئے بھیجنے پڑے۔ اس دوران پاک فوج کے دو انفنٹری بریگیڈوں (یعنی پیادہ انسانوں) نے دشمن کے ٹینکوں کو اپنی چھاتیوں پر روکے رکھا۔ اور جان کے نذرانے دیتے رہے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں (اور ہر محاذ پر) پاکستان کی دفاعی لائن کی کوئی گہرائی تھی ہی نہیں۔ نہ پچھلے مورچے تھے، نہ اس سے پچھلے اگر ہمارے اگلے مورچے اکھڑ جاتے تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا جو دشمن کو روکتا۔

کھیم کرن سیکٹر میں ٹینک رجمنٹ کے ایک رسالدار نے مجھے بتایا کہ بھارتی توپ خانے کے گولے ہمارے اگلے دستوں سے دور پیچھے گر رہے تھے کیونکہ دشمن ہماری سیکنڈ لائن کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ گولے خلا میں ضائع ہو رہے تھے، ہماری سیکنڈ لائن تھی ہی نہیں۔ میدان جنگ میں دوسری اور تیسری لائن انتہائی ضروری ہوتی ہے ورنہ شکست لازمی ہوتی ہے۔

جنرل چوہدری کی اسکیم بے عیب نہیں تھی۔ وہ پاک فوج کو اسی پوزیشن میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے جنگ کی اسکیم تیار کرتے وقت اپنی بے پناہ قوت اور پاک فوج اور فضائیہ کی ذرا جتنی نفری ہی کو سامنے رکھا تھا۔ وہ دو باتیں بھول گیا تھا۔ ایک یہ کہ پاک فوج اور فضائیہ بھی لڑنا جانتی ہے اور دوسری ضروری بات جو اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، یہ تھی کہ پاکستان کی دفاعی لائن کے اگلے مورچوں پر تو پاک فوج ہے لیکن پچھلے مورچوں میں دس کروڑ پاکستانی شہری ہیں ـــ دس کروڑ مردانِ حُر، مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ـــ جنرل چوہدری بریگیڈوں اور ڈویژنوں کے حساب سے قوت کا اندازہ لگاتا رہا لیکن اُس قطعاً کو خیال نہ

رہا کہ پاک فوج کا ہر ایک سپاہی اپنی جگہ مکمل قوت ہے۔ میدانِ جنگ میں قوت کو یونٹوں سے ناپا جاتا ہے، لیکن پاک فوج کی ہر اکائی اپنی جگہ کُل تھی۔ اُدھر ساز وسامان اور ڈویژنوں کا لشکر تھا، اِدھر انفرادی جذبہ تھا۔ یہ جنگ دراصل مورال اور میٹیریئل کی تھی۔ پاک فوج کے جذبے کو دس کروڑ شہریوں کی قوت حاصل تھی۔

یہ تجزیہ کچھ لمبا ہوتا چلا جارہا ہے میں سینکڑوں، ہزاروں میں سے صرف دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے واضح ہوجائے گا کہ پوری قوم کی قوت اگلے مورچوں تک کس طرح پہنچی تھی۔ میں خود حیران تھا کہ آخر وہ جذبہ کتنا قوی تھا جس کے زور پر انسانوں کے جسموں نے ٹینکوں کو روک کر بھسم کر ڈالا، اور ایک ساتھی کی لاش دیکھ کر ڈرنے کی بجائے ہمارے جیالے جانباز جذبۂ شہادت سے سرشار ہوگئے اور ایک دوسرے کے پیچھے شہید اور شدید زخمی ہوتے چلے گئے۔ میں گزشتہ دو برس سے فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے مل رہا ہو اور ان سے پوچھتا پھر رہا ہوں کہ مجھ پر وہ جذبہ واضح کریں۔ مجھے کئی طرح کے جواب ملے جن میں دو تین آپ بھی سن لیجئے۔

نارووال سیکٹر کے ایک توپچی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے لوئیس کرار والا سوال پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اَن پڑھ سپاہی ہے۔ فلسفی یا ماہر نفسیات نہیں۔ اُس نے ایک واقعہ سنا کر اپنے جذبے کی وضاحت کی۔ کہنے لگا کہ وہ بڑی گن (دوسو پونڈر) کا توپچی ہے۔ یہ گنیں بہت پیچھے نصب ہوتی ہیں۔ جس طرح لاہور کی رانی شہر سے فائر کرتی رہی تھی۔ اس توپچی کی توپ نارووال سیکٹر کے کسی گاؤں سے دواڑھائی فرلانگ دُور نصب تھی۔ ایک روز پاکستان کی ایک جواں سال دیہاتی بیٹی، سر پر چنگیر اور سالن کا پیالہ اُٹھائے اس توپ کے پاس جا پہنچی اور بولی ـــ ''ویرو! لو روٹی کھالو'' ـــ اس توپ پر چھ سات توپچی تھے۔ گن کسی ٹارگٹ پر فائر کر رہی تھی۔

ذرا سی دیر بعد فائر روکنے کا حکم مل گیا۔ ان توپچیوں نے اس عورت سے کہا کہ بہن! ہمیں راشن مل جاتا ہے، تم آئندہ یہاں نہ آنا۔ کوئی پتہ نہیں ہم پر کس وقت ہوائی حملہ ہوجائے۔ لیکن وہ بہن یوں چپ رہی جیسے اُسے دکھ ہوا ہو کہ اُسے توپ کے قریب جانے سے روکا گیا ہے۔ توپچیوں نے کھانا کھالیا۔ اس توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے ازراہِ مذاق اپنے ساتھی سے کہا ـــ کہ ''یار! لسی پیئے عرصہ ہوگیا ہے۔''

انہوں نے کھانا کھالیا اور وہ بہن چلی گئی۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد شاید دشمن کے ہوائی دیدبان Air O.P نے اس توپ کی پوزیشن دیکھ لی اور اپنے توپ خانے کو نشانہ ہی کردی۔ چنانچہ اس ایک توپ پر دشمن کے توپ خانے کی گولہ باری شروع ہوگئی۔ یہ گولہ باری کوئی ایک میل کے علاقے کو زد میں لئے ہوئے تھی۔ ہر سُو گرد اور سیاہ دھواں پھیل گیا اور دھماکوں سے زمین وآسمان لرزنے لگے۔

توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے جانے کیوں پیچھے دیکھا تو مجھے گرد وغبار میں کوئی آدمی جھاڑیوں کی اوٹ میں رینگتا دکھائی دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ کسی دوسری توپ یا کسی انفنٹری کا سپاہی ہوگا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے کپڑے خاکی نہیں تھے۔ ذرا ہی دیر میں مَیں نے پہچان لیا کہ وہ آدمی نہیں کوئی عورت تھی۔ جو گولوں سے بچنے کے لئے پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ میں بھاگ کر پہنچا۔ میں اُسے

پناہ میں لے لینا چاہتا تھا۔قریب جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو ہمیں کھانا کھلا کر گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لسی سے بھری ہوئی مٹی کی ڈولی تھی جسے وہ آگے دھکیلتی تھی اور رینگتی تھی، پھر اُسے دھکیلتی اور رینگتی تھی۔ وہ برستی آگ میں ہمارے لئے لسی لا رہی تھی ___ مجھے یاد آیا کہ میں نے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا کہ لسی پئے عرصہ ہوگیا ہے۔

توپچی بتاتا ہے کہ میں نے بڑے غصے سے اُسے کہا: ''پاگل! یہیں لیٹی رہو'' ___ اور میں خود اُس کے سامنے بیٹھ گیا تاکہ سامنے سے جو گولہ آئے وہ مجھے لگے، یہ بہن محفوظ رہے۔

اس توپچی نے پُرعزم لہجے میں کہا ___ ''آپ ہی بتایئے صاحب! ہم ان بہنوں کے نام پر کیوں نہ کٹ مرتے؟''

کھیم کرن قصور محور کے ایک حوالدار نے سنایا کہ پہلے روز ہماری پلٹن ڈیپلائے ہوکر میدانِ جنگ میں پہنچی تو میں اپنی پلاٹون کے ساتھ ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ گاؤں کے لوگ باہر کھڑے تھے، ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔انہوں نے نعرے لگائے۔بعض نے ہم سے ہاتھ ملائے اور بڑوں نے ہماری پیٹھ تھپکائی۔عورتوں نے دوپٹے پھیلا کر ہماری سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی ___ ''ویرو! تہاڈی جیہڑی کنڈ اساں دیکھی اے، اوہ ویری نہ دیکھے'' ___ ''بھائیو! تمہاری جو پیٹھ ہم نے دیکھی ہے وہ دشمن نہ دیکھے۔''

حوالدار سناتا ہے کہ گاؤں سے ذرا آگے چند جوان جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جب ہمارے سپاہی اُن کے قریب سے گزرے تو تین چار لڑکیوں نے اپنے ڈوپٹے اتار کر سپاہیوں پر پھینک دیئے اور ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹہ ایک سپاہی کی پیٹھ پر باندھ دیا۔

''اللہ کی قسم!'' حوالدار نے کہا ___ ''پھر کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے۔ نہ یہ یاد رہا کہ دشمن کی نفری کتنی زیادہ اور ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ ہم نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے دوپٹے کھیم کرن سے آگے پہنچا دیئے۔ ان میں سے میرے دو سپاہی شہید ہوئے تھے۔ میں نے ان کی لاشیں دیکھیں، دونوں نے اُن لڑکیوں کے دوپٹے اپنی فولادی ٹوپیوں پر لپیٹے ہوئے تھے۔''

ان دوپٹوں کا کرشمہ معمولی نہیں۔ ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ کھیم کرن قصور سیکٹر میں دشمن کی قوت کیا تھی ___ ایک مونٹین ڈویژن (نمبر 4) ایک مونٹین بریگیڈ (نمبر 41) اور (نمبر 2) انڈی پنڈنٹ آرمرڈ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ جس کی نفری ڈویژن جتنی تھی۔ یہ ٹینکوں کا گروپ تھا۔ ان کی پشت پناہی کے لئے دو توپ خانے بریگیڈ تھے ایک ہیوی (Heavy) اور ایک میڈیم ہیوی۔ اس ہیبت ناک قوت کے اوپر انڈین ائیر فورس کے طیاروں کا آتشیں چھاتہ تھا ___ کھیم کرن کے دفاعی مورچے چھمب اور جوڑیاں کی طرح لوہے اور سیمنٹ کے بنکر تھے۔ (ایک غیر ملکی وقائع نگار نے کھیم کرن کی فتح کے بعد ان بنکروں کو دیکھ کر کہا تھا ___ ''جو فوج ان مضبوط مورچوں سے بھاگ گئی ہے وہ فوج کہلانے کی مستحق نہیں۔'')

اس ہیبت ناک قوت کو ہمارے صرف ایک پیادہ بریگیڈ اور دو ٹینک یونٹوں نے شکست دے کر کھیم کرن فتح کیا تھا۔ حملے کے دوران ان ٹینک یونٹوں کے چوبیس ٹینک یہاں سے ہٹا کر سیالکوٹ سیکٹر میں بھیج دیئے گئے تھے۔ یعنی

اپنی قوت اور زیادہ کم ہوگئی تھی۔

کھیم کرن کی فتح میں ایک اور شہری قوت کارفرما تھی۔ وہ تھے ''معاشرے کے خطرناک ترین انسان''۔۔۔ قیدی قاتل اور ڈاکو جو لاہور جیل میں لمبی لمبی سزائیں بھگت رہے تھے ۔۔۔ کھیم کرن کے راستے میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور ''کٹھے'' تھے جو گولہ باری سے ٹوٹ کر دلدل پھیلا رہے تھے۔ اس سے پیش قدمی رُک رہی تھی رات کے وقت دو دو اور تین تین سو قیدی کسی پہرے کے بغیر جیل سے نکل کر میدانِ جنگ میں آجاتے تھے۔ اور وہ نہروں اور کٹھوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے مرمت کرتے تھے۔ ان کے لئے طویل قید سے بھاگ جانے کا یہ بڑا اچھا موقعہ تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ بعض اوقات ان قیدیوں پر گولہ باری ہونے لگتی تھی تو فوج کے کمانڈر انہیں پیچھے چلے جانے کو کہتے تھے لیکن قیدی ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ اس گولہ باری میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ہمیں اپنے حصے کا خون بہا لینے دو۔

ایک رات تین سو قیدی میدانِ جنگ میں اسی کام میں مصروف تھے کہ قیامت کی گولہ باری ہونے لگی قیدی بے بس ہو کر بکھر گئے۔ صبح کے وقت تین سو قیدیوں میں سے ڈیڑھ سو قیدی اکٹھے کئے جاسکے۔ اور انہیں جیل میں واپس لے آئے۔ خیال تھا کہ باقی یا زخمی ہوگئے ہیں یا قید سے مفرور ہوگئے ہیں لیکن دن کے بارہ بجے تک جیل میں قیدیوں کی گنتی پوری ہوگئی۔ جو قیدی محاذ پر بکھر گئے تھے وہ فرداً فرداً اتنی دور سے پیدل چل کر واپس جیل میں آگئے۔ ان میں چند ایک زخمی بھی تھے۔

جنرل چوہدری جنگ کی اسکیم بناتے وقت پاکستان کی اس قوت کو بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلے مورچوں میں پاک فوج ہوگی ۔۔۔ لیکن وہاں دس کروڑ شہری تھے جو پاک

## اسلام کے دشمن

''اسلام کے دشمن دانستہ، اور نادان دوست نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے۔ لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرسکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جارہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتادیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔'' (طلوعِ اسلام کنونشن، 1959ء)

فوج کے لئے ایسی قوت بن گئے تھے اگر انڈین آرمی کے اکیس ڈویژن پاکستان کی سرحد پر ذلت کی موت مر گئے ۔۔۔ اس فوج کو ۔۔۔ خدا کے اس ان گنت لشکر کو، نہ تو جنرل چوہدری کی آنکھ دیکھ سکی تھی اور نہ ہی ''ٹائم'' کے وقائع نگار کی نگاہ بھانپ سکی ۔۔۔ اور اس فوج کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# میرا پیغام

مئے من از تنک جاماں نگہدار　　شرابِ پختہ از خاماں نگہدار
شرر از نیستانے دور تر بہ　　بخاصاں بخش و از عاماں نگہدار

برادران عزیز—— السلام علیکم

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، میں گزشتہ پچیس تیس برس سے مسلسل قوم کے نام ایک پیغام دیئے چلا آرہا ہوں۔ جوں جوں اس پیغامِ حیات آور کے اثرات فضا کی پہنائیوں میں پھیلتے اور دلوں کی گہرائیوں میں اُترتے جارہے ہیں۔ مفاد پرست طبقات کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھتی جارہی ہے چونکہ مخالفین کے پاس، اس پیغام کی تردید کے لئے نہ کوئی سند ہے نہ دلیل، اس لئے وہ کرتے یہ ہیں کہ پہلے اُسے نہایت غلط انداز سے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر ان غلط بنیادوں پر اپنی مخالفت کی عمارت استوار کرتے چلے جاتے ہیں—— یہ منکرِ خدا ہے—— یہ منکرِ رسالت ہے۔ یہ ایک نیا مذہب پیش کر رہا ہے۔ یہ تین نمازیں اور نو دن کے روزے بتاتا ہے، یہ اردو میں نماز پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ کسی دن نبوت کا دعویٰ کرے گا—— یہ، اور اس قسم کے اور الزامات نت نئے دن تراشے اور میری طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ چونکہ میرا پیغام طلوعِ اسلام کے ہزار صفحات، اور میری تصانیف کے بے شمار اوراق میں بکھرا پڑا ہے۔ اور ہر شخص سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ طلوعِ اسلام کی فائلوں اور میری کتابوں کی اوراق گردانی کرکے، اس پیغام کو اس کی حقیقی شکل میں اپنے سامنے لے آئے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں یکجا بیان کر دیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں کیا کہتا ہوں، اور کیا چاہتا ہوں اور قدامت پرست طبقہ کی طرف سے میرے خلاف جو الزامات عاید کئے جاتے ہیں، ان کی اصل وحقیقت کیا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں، اس کی تفصیل کتنی ہی طول وطویل کیوں نہ ہو، اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ

(1) اسلام، خدا کی طرف سے دیا ہوا، آخری اور مکمل دین، یعنی نظام حیات ہے۔

(2) اس دین کو نبی اکرم ﷺ نے عملاً متشکل کر کے، دنیا کو دکھا دیا کہ اس زمین پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال کس طرح بچھتا ہے اور اس کے نتائج نوعِ انسان کے لئے انسانیت ساز خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے حامل ہوتے ہیں۔

(3) بعد کے آنے والے مسلمانوں نے اس نظام کو آگے نہ چلایا۔ اور ہم خدا کی راہ کو چھوڑ کر، انسانوں کے تراشیدہ

غلط راستوں پر پڑ گئے جس کا نتیجہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

(4) میری دعوت یہ ہے کہ، ان غلط راستوں کو چھوڑ کر، پھر اسی نظام کو متشکل کر لیں۔ اس کے لئے بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ اس نظام کے ضابطہءحیات، یعنی قرآن کریم کو زندگی کے ہر معاملہ میں غلط اور صحیح، اور حق و باطل کا معیار قرار دیا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اُسے صحیح تسلیم کیا جائے اور جو اُس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

آپ کہیں گے کہ اس میں کون سی ایسی بات ہے جو خلافِ اسلام ہے، اور جس کی مخالفت میں اس قدر طوفان برپا کیا جا رہا ہے۔ اس میں خلافِ اسلام تو کوئی بات نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآنی نظام میں مفاد پرست گروہوں کا وجود باقی نہیں رہتا ـــــ اس میں کسی فرعون، ہامان یا قارون کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ـــــ اس لئے ان گروہوں کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ناگزیر ہے۔ لیکن ان لوگوں میں اتنی جرات نہیں ہوتی، کہ برملا یہ کہہ سکیں کہ ہم اس کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ہمارے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے یہ ''اسلام خطرے میں ہے'' کی گھنٹی بجا کر عوام کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور یوں انہیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے آلہ کار بناتے ہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جونہی کسی نے ان کی مفاد پرستی اور ابلہ فریبی کے خلاف آواز بلند کی، انہوں نے کفر و الحاد کے فتوے لگانے شروع کر دیئے۔ یہی کچھ پہلے ہوتا رہا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ملک کے سنجیدہ، دانشور طبقہ سے میری شروع سے یہ گزارش رہی ہے۔ اور آج میں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہتا ہُوں اسے خود قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ وہ اسلام کے خلاف ہے یا اس کے مطابق۔

اب آپ دیکھئے کہ میرے پیغام کی تفصیل کیا ہے؟

## مولانا آزاد کی تفسیر

میں ہنوز، قرآن کریم کو غور و فکر کے ساتھ سمجھنے کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا کہ 1932ء میں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے تفسیری ترجمہ ـــــ ترجمان القرآن ـــــ کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے، سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلہ میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اُس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

میری بصیرت قرآنی کے مطابق، یہ نظریہ، اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہموسماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے۔ قرآن کی نہیں۔ اس لئے میں نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا، جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں، میں نے کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کے رسول، دنیا کی ہر قوم کی طرف آئے تھے۔ اور وہ اصولی طور پر ایک ہی دین لائے تھے لیکن وہ تعلیم اب دنیا کی کسی قوم کے پاس اپنی اصل شکل میں موجود نہیں، وہ صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے اب خدا کی طرف سے سچا دین وہی ہے جو اس کتاب کے اندر ہے۔ اب انسانوں کو نجات وسعادت کے لئے رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لانا، اور قرآن کریم کی طرف سے پیش کردہ دین کو خدا کا واحد ،سچا دین تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جو اس دین کو اپنا نصب العینِ حیات قرار نہیں دیتا۔ نہ اس کی خدا پرستی، خدا پرستی ہے، نہ نیک عملی درحقیقت نیک عملی۔

مولانا آزاد کی شہرت اس زمانے میں تابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ، اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت، اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے، کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے ابتداء ہر طرف سے میری مخالفت ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ہنگامہ خیزی کے بادل چھٹے تو، اور تو اور، خود مولانا آزاد کے حلقہء ارادت کے بعض نامور افراد تک نے بھی میری گزارشات کو درخورِ غور و فکر سمجھا، اور مولانا کے آزاد کے پیش کردہ تصور کو غلط قرار دے دیا۔

## دین اور مذہب

جب میں نے مولانا آزاد کے پیش کردہ نظریہ کی لِم پر غور کیا ـــــ جو بظاہر بڑا خوش آیند اور مذہبی رواداری کا آئینہ دار نظر آتا ہے، ـــــ تو اس کی یہ وجہ سامنے آئی کہ اسلام، جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین ہے، مذہب کی سطح پر آ چکا ہے اور مذہب کی سطح پر مختلف مذاہب میں واقعی کوئی فرق نہیں رہتا ـــــ دین، زندگی کا عملی نظام ہے اور نظام ایک ہی سچا ہو سکتا ہے۔ اس نظام میں خدا پرستی سے مقصود ہوتا ہے، خدا کے قوانین کو دنیا میں عملاً نافذ کرنا۔ اور نیک عملی کے معنی ہوتے ہیں ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا ـــــ اس کے برعکس، مذہب نام ہوتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو ہر قسم کے نظام میں قائم کیا اور باقی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تعلق، انسان کے اپنے ذہنی تصور سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں خدا پرستی سے اتنا ہی مقصود ہوتا ہے ـــــ باقی رہی نیک عملی، سو وہ چند اخلاقی مواعظ کا نام ہوتی ہے جو دنیا میں قریب قریب ہر جگہ یکساں پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو ستاؤ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام خدا کی طرف سے دین لائے لیکن، ان کے بعد، ان کے پیرو اس دین کو مسخ کر کے مذہب کی سطح پر لے آئے۔ دنیا کے مذاہب، خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کی مسخ شدہ صورتیں ہیں۔ یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں، نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ حضور ﷺ نے

اسے عملاً متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس کے نتائج، عالم انسانیت کے لئے کس قدر خوشگوار ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد، اس دین کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو اس سے پہلے دیگر اقوام کے یہاں ہوا تھا۔ اس کے نام لیواؤں نے رفتہ رفتہ اسے بھی مذہب کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ چند بے جان عقاید اور چند بے روح رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اسی مذہب کا نام اب اسلام ہے۔ لیکن ہم میں اور دیگر مذاہب میں فرق یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس خدا کی کتاب، جس میں دین دیا گیا تھا، اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اور ہمارے پاس قرآن کریم غیر محرف شکل میں محفوظ ہے۔ لہذا، اگر وہ لوگ چاہیں بھی کہ وہ اپنے مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کر لیں تو ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ ممکن ہے۔ ہم قرآن کریم کی رُو سے، خدا کے حقیقی دین کو پھر سے متشکل کر سکتے ہیں۔

## بنیادی نقطہ

میری دعوت کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ مذہب کی جگہ، خدا کی طرف سے عطا کردہ دین کو دوبارہ قائم کریں تاکہ سب سے پہلے، ہمارے اپنے معاشرہ کا وہی نقشہ ہو جائے جو عہد مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (رضی اللہ عنہم) میں تھا۔ اور اس کے بعد، ہم اس کے انسانیت ساز نتائج کو سامنے لا کر، اس دین (نظام زندگی) کو باقی دنیا میں بھی عام کریں۔

## ختمِ نبوّت

قرآن کریم کو دین کا مکمل ضابطہ ماننے، اور اس کے اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہنے کا فطری اور لازمی نتیجہ، ختمِ نبوت کا عقیدہ ہے۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے راہ نمائی پانا۔ یہی راہ نمائی دین کا ضابطہ کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا ضابطہ ـــ جو کسی خاص زمانے اور خاص مقام کے لئے نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کے لئے ابدی ضابطۂ حیات ہے ـــ ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (جو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ہے) تو پھر نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ـــ ابدی، عالمگیر، مکمل اور محفوظ راہ نمائی کے بعد، خدا کی طرف سے کچھ اور دیئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــ لہذا، اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرنے کے بعد لازمی طور پر اگلی کڑی یعنی ختم نبوت کی حقیقت اور اہمیت کو واضح اور اجاگر کرنا تھا۔ اور یہ میری دعوت کا دوسرا نقطہ تھا۔ اس زمانہ میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں، احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان ایک مقدمہ چل رہا تھا جس نے ملک میں خاصی شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اس سلسلہ میں بحث کا نقطۂ ماسکہ ختم نبوت کا سوال تھا۔ مقدمہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ بالآخر جج نے اپنا فیصلہ سنایا، اور اس میں ختم نبوت سے متعلق، میرے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے، اس نے لکھا کہ مقدمہ کے سلسلہ میں اس مسئلہ کو جس قدر سلجھانے

کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ اسی قدر الجھتا چلا جاتا تھا، تآنکہ (محولہ بالا) مقالہ میری نظر سے گزرا۔ اور اس نے اس مسئلہ کو اس طرح صاف کر دیا کہ اس بارے میں میرے دل میں کوئی شبہ باقی نہ رہا کہ ختمِ نبوت واقعی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ میں نے اس مقالہ میں، اس موضوع پر، خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے بحث کی تھی جس کے بعد، اس میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

میں نے جب اس مسئلہ پر قرآن کریم کی روشنی میں غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہم بابِ نبوت کے بند کرنے کے عقیدہ کے تو اس شدومد سے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی، ہم ان عقائد اور نظریات پر بھی شدت سے قائم ہیں جو اس دروازے کو نہایت آسانی سے کھول دیتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ بند ہونے ہی نہیں دیتے۔ یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی کا ملنا۔ وحی وہ علم ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے۔ وحیؔ کے علاوہ، ہر علم، انسان کی اپنی محنت وکاوش، غور وفکر، عقل وبصیرت، تجربہ ومشاہدہ وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن وحیؔ میں ان امور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ نبی کو خدا کی طرف سے، براہ راست ملتی ہے۔ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کسی انسان کو اب خدا کی طرف سے ایسا علم نہیں مل سکتا۔ یہ علم، قرآن کے اندر آ چکا ہے۔ اس کے بعد، اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انسانی علم کے ذرائع دو ہی ہیں ___ قرآنِ کریم اور عقل انسانی۔

## کشف والہام

لیکن ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے جس میں ان کی اپنی عقل وفراست کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھا کہ حقیقت کے اعتبار سے یہ بعینہ وہی چیز ہے جسے وحیؔ کہا جاتا ہے لیکن انہوں نے صرف اس کا نام بدل دیا ہے۔ یہ اسے وحی کی بجائے الہام یا کشف کہتے ہیں۔ لیکن نام بدل دینے سے کسی شے کی حقیقت اور ماہیت تو نہیں بدل جاتی۔ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا نام وحی رکھ لیجئے یا الہام، بات ایک ہی ہے۔ اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، قیاس پر مبنی نہیں۔ ان حضرات کا دعویٰ یہی ہے۔ چنانچہ سرخیلِ طائفۂ صوفیاء، شیخ اکبر، محی الدین ابنِ عربی، اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں:۔

جس مقام سے نبی لیتے تھے اُسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ہیں ___ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن وحدیث سے حکم دیتے ہیں ___ مگر اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں ___ پس ایک طور پر مادہ ءکشف والہام اور مادۂ وحیِ رسول ایک ہے۔ صاحبِ کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین سے موافق ہے ___ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے ___ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔

تصوف

آپ نے غور فرمایا، برادران عزیز!—— کہ اس عقیدہ کے بعد، وحی رسول اوران حضرات کے الہام اور کشف میں کوئی بھی فرق رہ جاتا ہے؟ یہ عقیدہ، تصوف کی اصل و بنیاد ہے۔ صوفیہ کے مختلف خانوادوں میں، فروعات کا جو فرق ہو سو ہو، لیکن یہ بنیادی عقیدہ ہر ایک کے ہاں پایا جاتا ہے۔ لہذا، تصوف، اسلام میں اُس مہر کو توڑنے کے لئے لایا گیا تھا جس نے نبوت کے دروازے کو بند کیا تھا۔ یہ مذہب کی سطح پر ہی مسلمانوں میں آ سکتا تھا۔ دین میں اس قسم کے عقاید کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

وحدت الوجود

(دو ایک خانوادوں کو چھوڑ کر) تصوف کا دوسرا بنیادی عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے—— انسان، حیوان، درخت، پہاڑ وغیرہ—— یہ سب خدا ہی ہے جس نے مختلف روپ دھار رکھے ہیں۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ وہ ہے جسے ابن عربی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے (جنہیں میں ہزار ہزار توبہ کے بعد نقل کرنے کی جرات کرتا ہوں) فصوص الحکم میں لکھا ہے۔

اس (فرعون) کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے—— اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ، معاذ اللہ، صد ہزار بار معاذ اللہ)

در مذہبِ عاشقانِ یک رنگ      ابلیس و ❶ است یک سنگ

(حدیقہ سنائی)

رومی کہتا ہے:

می گفت در بیاباں رند دہن دریدہ!      صوفی خدا ندارد ، اونیست آفریدہ

ان کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جس چیز کو لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ سب خدا ہی ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ

کفر و دین است دررہت پویاں      وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ گویاں

پنجابی زبان میں تو آپ نے اس قسم کی کافیاں اکثر سنی ہوں گی کہ:

آپے دھیاں، تے آپے پُتر، آپے بنیا ماپے      آپے مارے، تے آپ پٹے، آپے کرے سیاپے!

یعنی ——————

---

❶ یہاں حضور نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی لکھا ہے۔ (استغفر اللہ)

خودکوزہ وخودکوزہ گروخودگلِ کوزہ خودرندوسبوکش  خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد، بشکست وروان شد

یہ حضرات جو ہمارے ہاں بڑے سے بڑے صوفیائے کرام اور ولی اللہ کی حیثیت سے متعارف ہیں، ان میں سے بیشتر کا یہی عقیدہ تھا (اور اب بھی وہ یہی عقیدہ رکھتے ہیں)۔

اسی عقیدہ کی ذراسی بدلی ہوئی شکل یہ ہے کہ انسانی روح، خدا کی روح کا ایک حصہ ہے۔ یہ روح مادہ کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کسی طرح اس روح کو مادہ کی دلدل سے نکال دے۔ تا کہ یہ جزو اپنی اصل (روح خداوندی) کے ساتھ جا کر مل جائے۔ روح کی اسی جدائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا رومؔ اپنی مشہور مثنوی کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند  از جدائی ہا شکایت مے کند

اور غالب تگ و تازِ زندگی کا منتہی ہی یہ بتاتا ہے کہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دنیا سے نفرت کرے، خانقاہیت کی زندگی اختیار کرے۔ جوں جوں انسان اس طریقِ خانقاہیت میں پختہ ہو جائے گا، افراد اور اقوام کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی نہیں مرنے کے بعد بھی لوگوں کی قسمت کے فیصلے کرے گا۔

اس عقیدہ نے یونان میں جنم لیا۔ ایران کے آتشکدوں میں اسے پختگی حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں آ کر اس نے ویدآنت کے طلسماتی فلسفہ کی شکل اختیار کی اور پھر مسلمانوں میں عین دین ہی نہیں بلکہ مغزِ دین بن گیا۔ چنانچہ مولانا رومؔ لکھتے ہیں کہ

ماز قرآں مغزرا برداشتیم  استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یہ ہے وہ تصوف جسے عین اسلام ہی نہیں، بلکہ مغز اسلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں عام ہے اور ہر ایک کے ذہن پر مستولی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے وہ فرقے جو اپنے آپ کو متشدد طور پر بدعت کے خلاف اور متبع سنتِ رسول اللہ کہتے ہیں، وہ بھی کشف والہام کے قائل اور کرامات کے معتقد ہیں۔ بیعت لیتے ہیں اور ورد و وظائف کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآنی آیات کے تعویذ لکھتے ہیں اور پانی دم کر کر کے مریدوں کو پلاتے ہیں۔

میرا پیغام یہ ہے کہ، جب تک ہم میں تصوف باقی ہے، ہم دین کی سطح پر نہیں آ سکتے۔ تصوف کا نام تک نہ قرآن میں ملتا ہے، نہ ہمارے ابتدائی لٹریچر میں کسی اور جگہ۔ یہ، اقبال کے الفاظ میں، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔

## مامورین من اللہ

ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ تھا کہ اب کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکے گا کہ میں مامور من اللہ ہوں۔ یعنی مجھے خدا نے ایک خاص مقصد کے پورا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ خدا کی طرف سے مامور، حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے تھے۔ جب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو مامورین من اللہ کی آمد بھی بند ہو گئی۔

لیکن جب اسلام، دین کی سطح سے گر کر مذہب کی سطح پر آ گیا تو، ہم میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا ہے کہ مامورین من اللہ وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے۔ ان میں سے، مجددین کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ وہ ہر سو سال کے بعد آیا کریں گے۔ ان کے علاوہ، قیامت کے قریب، امام مہدی تشریف لائیں گے اور آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے۔ دین میں ان عقاید کی بھی گنجائش نہیں۔ قرآن کریم میں ان آنے والوں کا کوئی ذکر نہیں۔ مامورین من اللہ کا عقیدہ بھی ختم نبوت کے منافی اور دین کی نقیض ہے۔ اور یہی میری پکار ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد، اب نہ کوئی نبی آ سکتا ہے، نہ کسی اور نام سے مامور من اللہ۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بأو نرسیدی تمام بولہبی است

نبوت حضور ﷺ پر ختم ہو گئی اور دین قرآن میں مکمل ہو گیا۔ اللہ بس۔ باقی ہوس!

## مذہبی فرقہ بندی

خدا کی طرف سے جو دین ملا، وہ ایک تھا۔ اس کی بنیادوں پر، نبی اکرم ﷺ نے جو امت تیار کی وہ امت واحدہ تھی۔ اس امت کا ایک خدا، ایک رسول، ایک ضابطہء زندگی، ایک نصب العین حیات، ایک مسلک اور ایک منہاج تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا، کوئی تفرقہ نہ تھا۔ اختلاف کو خدا نے عذاب قرار دیا ہے۔ اور فرقہ بندی کو بہ نص صریح شرک بتایا ہے (30:31) اس لئے اس امت میں باہمی اختلاف کیسے پیدا ہو سکتا، اور فرقے کیسے وجود میں آ سکتے تھے؟

لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اس میں سینکڑوں اختلافات نمودار ہو گئے -- اور ان اختلافات کو رحمت کہہ کر پکارا گیا -- ان میں متعدد فرقے پیدا ہوتے چلے گئے جن میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا (اور ہے) کہ میں نجات یافتہ ہوں اور باقی سب گمراہ، فلہٰذا، جہنمی۔

لیکن سوال کسی ایک فرقے اور دوسرے فرقے کا نہیں۔ دین میں سرے سے فرقوں کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ فرقے،

مذہب میں باقی رہ سکتے ہیں، دین میں نہیں۔ اس لئے جب قرآن کریم کا نظام ہو گا تو اُس میں صرف اُمتِ مسلمہ ہو گی۔ اس اُمت میں فرقہ کوئی نہیں ہو گا۔

## دین اور دنیا کی ثنویت

دین اس لئے دیا گیا تھا کہ انسان اپنے دنیاوی امور، قوانین خداوندی کے مطابق، سرانجام دے۔ یا، اقبالؔ کے الفاظ میں ’انسان‘ دنیا کا ہر تالہ دین کی چابی سے کھولے۔ اس تعلیم کی رُو سے دین اور دنیا اور مذہب اور سیاست میں ثنویت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو اس میں مذہبی امور اور دنیاوی امور، دو الگ الگ شعبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ دنیاوی امور، اربابِ سیاست کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں مذہب سے تعلق نہیں رہتا۔ امور مذہبی، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں آ جاتے ہیں، اور امور دنیا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دونوں کے دوائر الگ الگ اور متمیز ہو جاتے ہیں، اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دو الگ الگ شعبے ہو جاتے ہیں۔ ’’دنیا داروں‘‘ کا آخرت میں کم حصہ قرار دیا جاتا ہے اور آخرت سنوارنے والے، دنیاوی مفاد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ تصور، قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، دونوں کا وجود مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ دین میں نہ ملوکیت ہوتی ہے اور نہ مذہبی پیشوائیت ــ ملوکیت سے مراد وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اس سے مقصد ہر وہ انداز حکومت ہے جس میں خدا کا قانون ــ جو اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہے ـــ نافذ نہ ہو۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں پھر سے دین کا نظام قائم ہو۔

## نظامِ سرمایہ داری

دین کے نظام کی غرض و غایت یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو نہ محتاج۔ اس نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ اور ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کی نمود، اور اپنی ذات کی نشو و نما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ یہ نظام اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو نہیں سکتا جب تک رزق کے وسائل (یعنی ذرائع پیداوار) پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، نظام خداوندی کی تحویل میں رہیں گے، تو معاشرہ میں سرمایہ داری کا تصور تک پیدا نہ ہو گا۔ ملوکیت، اور مذہبی پیشوائیت کی طرح، دین اور سرمایہ

داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے ساتھ نظام سرمایہ داری بھی عین مطابق شریعت قرار پا جاتا ہے۔اس شریعت کی رُو سے انبار در انبار دولت جمع کرنا، زمین کے لامحدود رقبوں کو ذاتی ملکیت میں لے لینا، بے حد و نہایت جائیدادیں کھڑی کرتے جانا سب جائز ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں سے خدا کے نام پر کچھ پیسے الگ کر دیئے جائیں۔اور ثواب حاصل کرنے کے لئے انہیں خیرات کے طور پر غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا جائے۔اس کے بعد خلقِ خدا پر کیا گزرتی ہے، اس سے ان دولتمندوں کو، از روئے شریعت کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

اس قسم کا تصورِ معیشت، قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔اُس کی رو سے، معاشرہ کے ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا، اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما اور ذات کی برومندی کے لئے سامانِ پرورش بہم پہنچانا۔۔دین کے نظام کی اولین ذمہ داری ہے۔ یہ اس نظام کا کام ہے کہ دیکھے کہ ذرائع پیداوار کا انتظام کس طرح کیا جائے جس سے وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔

قوم کے سامنے قرآن کریم کے اس تصور کا عام کرنا تا کہ وہ اس قسم کا معاشی نظام قائم کرے۔۔۔میری دعوت کا مقصود ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کے نظامِ ربوبیت اور کمیونزم میں بُعد المشرقین ہے۔جس فلسفہء حیات پر کمیونزم کا معاشی نظام استوار ہوتا ہے، وہ فلسفہء اسلام کے فلسفہء زندگی کی یکسر نقیض ہے۔اُس فلسفہ کی رُو سے نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ وحی کو، نہ انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے نہ مستقل اقدار زندگی کو، نہ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہوتا ہے نہ حیاتِ آخرت پر۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس حقیقت کا بہ تکرار واصرار اعلان کرتا رہتا ہوں کہ کمیونزم کے فلسفہء حیات کو ماننے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔اور یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ بھی میری دعوت کی اسی طرح مخالفت کرتے ہیں جس طرح نظامِ سرمایہ داری کے حامل اور مؤید۔قرآن کا معاشی نظام اس کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور یہ کسی دوسرے فلسفۂ حیات سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

## عقل وبصیرت

دین اپنے ہر دعوے کو قرآنی سند کے ساتھ پیش کرتا اور علم وبصیرت کی بنا پر منواتا ہے۔وہ، قرآن کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں، عقلِ انسانی سے کام لینے کو مومنین کا شیوہ قرار دیتا ہے۔ وہ مومنون کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ، اور تو اور، آیاتِ خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں جھکتے (25:73)۔وہ انہیں عقل وبصیرت کی رو سے مانتے ہیں۔قرآن کی رُو سے، ایمان نام ہی، وحی کی صداقتوں پر، دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے بعد، یقین کرنے کا ہے۔

لیکن جب دین مذہب کی سطح پر آ جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے علم اور عقل کو دیس نکالا دے دیتا ہے۔اس لئے کہ مذہب پنپتا ہی تاریکیوں میں ہے۔اس کے پاس نہ اپنے کسی دعوے کی تائید میں قرآن کی سند ہوتی ہے نہ عملی اور عقلی دلائل۔"جو کچھ

ہوتا چلا آ رہا ہے" اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا، اس کے نزدیک صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔ جو کچھ ہم سے پہلے کسی انسان نے کہہ دیا، اس پر کسی قسم کی تنقید کرنا، یا اسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھنا، انتہائی گستاخی اور الحاد و بے دینی ہے۔ اگر آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، یا کسی اور مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں تو اس کے بعد، کسی ایسے عقیدہ کے خلاف جو متوارث چلا آ رہا ہے، کسی خیال کا اظہار، آپ کو مرتد بنا دے گا۔ جس کی سزا موت ہے۔

میری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس قسم کے تصورات، اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اور میری دعوت ان کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ اسلام روشنی ہے تاریکی نہیں۔ قرآن کریم، نوعِ انسان کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کے لئے دیا گیا تھا۔ وحی کی روشنی میں عقلِ انسانی سے کام لینا۔۔ دین کا بنیادی تقاضا ہے۔

## عورت کی پوزیشن

قرآن کریم کی رُو سے، ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ اور عورت بھی اسی قسم کی انسان ہے جس قسم کا انسان مرد ہے۔ انسان ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ افزائشِ نسل کے سلسلہ میں اس فطری وظیفہ کے علاوہ جو عورت سے مخصوص ہے، مرد اور عورت کی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں۔ عورت زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کی رفیق ہے اور ان کی باہمی رفاقت سے زندگی کی گاڑی آگے چلتی ہے۔

لیکن مذہب نے ہمیشہ عورت کو مرد کا غلام بنائے رکھا ہے۔ وہ اسے مقامِ انسانیت دینے پر کسی صورت میں رضامند نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اس نے ایک عقیدہ وضع کیا کہ خدا نے پیدا تو آدم (مرد) ہی کو کیا تھا لیکن جب وہ تنہائی کی وجہ سے اداس رہنے لگا، تو اس کی پسلی سے عورت کو نکالا تا کہ اس سے اس کا دل بہل جائے۔ گویا فطرت کے تخلیقی پروگرام میں مقصود بالذات مرد تھا۔ عورت، محض مرد کا دل بہلانے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن عورت نے شیطان کے فریب میں آ کر مرد کو بہکایا اور اس طرح اس بے گناہ کو جنت سے نکلوا دیا۔

اب ضروری ہے کہ عورت اپنے اس جرم کی سزا بھگتے۔ اور یہ سزا وہ مرد کے ہاتھوں بھگتتی ہے۔ ہم نے ان خیالات کو اسرائیلیات سے لیا اور انہیں عین اسلامی بنا کر اپنے عقاید میں داخل کر لیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

چونکہ یہ عقاید قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں، اس لئے میں ان کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتا رہتا ہوں۔۔ میرا پیغام، عورت اور مرد دونوں کے لئے یکساں مقامِ انسانیت کا پیغام ہے۔

یہ عقیدہ کہ عورت، مرد کا دل بہلانے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس قدر عام کیا گیا، کہ خود عورت نے بھی یہی سمجھ لیا کہ اس

کا مقصدِ زندگی، مرد کے لئے جاذب توجہ بننا ہے۔

اس عقیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت، ہر وقت اپنی نمود و نمایش کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے۔ قرآن کریم نے جو عورت کو زینت و زیبائش کی نمود سے منع کیا ہے تو اس سے وہ عورت کو اس کے صحیح مقام انسانیت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ تیرا مقصدِ زندگی، مرد کا کھلونا بننا نہیں، شرف انسانیت کا بلند مقام حاصل کرنا ہے۔

میں عورت تک خدا کا یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں دنیا میں قرآن کے اس تصور کو عام کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جب عورت اور مرد کے متعلق گفتگو کریں، تو دو انسانوں کی حیثیت سے گفتگو کریں۔ یہ دونوں انسان ہیں اور انسانیت کی میزان میں ان کا وزن یکساں ہے۔

---

# تحریکِ پاکستان

آپ نے غور کیا ہوگا، برادران عزیز! کہ ہمارے ہاں عقیدہ و عمل کی تمام خرابیوں کی علت العلل یہ ہے کہ اسلام جو ایک دین تھا، مذہب میں بدل چکا ہے۔ لہذا، ان خرابیوں کا علاج صرف ایک ہے کہ اسے مذہب کے مقام سے اُٹھا کر پھر سے اُس دین میں تبدیل کر دیا جائے جسے خدا نے نوع انسانی کیلئے (قرآن کریم میں) عطا کیا تھا، اور جسے اس کے رسول (ﷺ) نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا۔

## اس کا طریق

سوال یہ ہے کہ اس مذہب کو دین میں بدلنے کا طریقہ کیا ہے۔ میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ دین ایک نظامِ حیات ہے، جس میں، خدا کے احکام کو بطور قوانین نافذ کیا جاتا اور ان کے مطابق زندگی بسر کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حکم یا اصول کو بطور قانون اسی صورت میں نافذ کیا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کے ماننے والوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ دوسروں کی مملکت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے۔ چنانچہ جب غیر منقسم ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے الگ آزاد مملکت کے حصول و قیام کی تحریک شروع ہوئی -- جسے تحریک مسلم لیگ یا تحریک پاکستان کہا جاتا ہے -- تو طلوع اسلام جاری ہوا۔ اور اس نے قرآنی خطوط پر اس تحریک کا پورے شد و مد سے ساتھ دیا۔ جو حضرات اس تحریک کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس تحریک کی سخت مخالفت ہوئی۔ بجز چند افراد کی، علماء کا گروہ، مجموعی طور پر اس کا مخالف تھا۔ اس گروہ کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا حُسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ (مرحومین) جیسے اکابر مفتیانِ شرعِ مبین تھے۔ تحریک پاکستان اور ان حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت در حقیقت

دین اور مذہب کی کشمکش تھی۔ (اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں نے اس تذکرہ کی ابتداء مولانا آزاد مرحوم سے کیوں کی ہے؟) یہ حضرات اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ دین کا تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔۔ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔۔ اور یہ پانچوں کے پانچوں ہر اس مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں جو ان کی ادائیگی پر پابندی عاید نہ کرے۔ اور آزاد ہندوستان میں ان کی ادائیگی کی مسلمانوں کو کامل آزادی ہوگی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام پر کاربند ہونے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے، اپنے ''سیاسی مقاصد'' کے لئے خواہ مخواہ اسلام کو درمیان میں گھسیٹ لانا ہے۔ ان کے مقابلہ میں 'طلوعِ اسلام' اسلام کو بہ حیثیت دین (نظامِ زندگی) پیش کرتا اور قرآن کریم کی واضح تعلیم کی روشنی میں اس حقیقت کو نمایاں کرتا تھا کہ ایک آزاد خطۂ زمین، اسلام کے احیاء کے لئے اولین شرط ہے۔ اسی کشمکش میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی، کہ مذہب اصطلاحات تو وہی استعمال کرتا ہے جنہیں دین متعین کرتا ہے۔ لیکن ان اصطلاحات کا مفہوم اور تصور بدل دیتا ہے۔۔ کلمہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، امام، جماعت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، ثواب، عذاب، اطاعت ومعصیت، خدا اور رسول وغیرہ اصطلاحاتِ دین نے استعمال کی تھیں۔ یہ اصطلاحات اُس نظام کے مختلف گوشوں کو سامنے لاتی تھیں۔ اور عملاً بتاتی تھیں کہ ان میں سے ایک ایک جزو کس طرح دین کی عمارت کے لئے لاینفک ہے۔ مذہب نے انہی اصطلاحات کو اپنے ہاں منتقل کر لیا۔ لیکن ان کا مفہوم اور تصور بدل دیا۔ یہ سب سے بڑا مغالطہ ہے جو مذہب، اپنے برسرِ حق ہونے کے لئے پیدا کرتا ہے۔

## دین کی اصطلاحات

یہ وہ ٹکنیک تھی جسے متحدہ ہندوستان کی تحریک کے حامی، نیشلسٹ علماء استعمال کرتے تھے۔ اور اس سے عوام بڑی آسانی سے فریب میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اس سے اس امر کی اہمیت اجاگر ہو کر میرے سامنے آئی کہ جب تک ان اصطلاحاتِ دینیہ کا صحیح تصور (قرآن کریم کی روشنی میں) متعین کر کے سامنے نہ لایا جائے، دین کی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ چونکہ اس کی حیثیت بنیادی تھی، اس لئے اس فریضہ کو میں نے خاص طور پر اپنے ذمہ لیا۔ اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس کی ادائیگی میں صرف کیا (اور اب تک کر رہا ہوں) اس سلسلہ میں میری متفرق کوششوں کے علاوہ، لغات القرآن بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں میں نے کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کے پیش کردہ تمام تصورات کا صحیح مفہوم متعین کر کے سامنے لایا جائے۔ یہ کتاب، قرآنی الفاظ کے معانی ہی نہیں دیتی، دین کے تصورات کا صحیح مفہوم بھی متعین کرتی ہے۔

میری پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے کے لئے اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ازبس ضروری ہے۔ یعنی اس نکتہ کا کہ ہمارے ہاں الفاظ اور اصطلاحات تو قرآن ہی کی رائج ہیں، لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل چکا ہے۔ دین کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا صحیح (قرآنی) مفہوم سامنے آئے۔

# اسلامی نظامِ مملکت

پاکستان بننے سے، ایک آزاد خطہء زمین حاصل ہوگیا، تو اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کا سوال سامنے آیا۔ اس لئے کہ خطۂ زمین کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ لہٰذا اصل کام، خطہء زمین کے بعد شروع ہوا۔ اور یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ اب دین اور مذہب میں جنگ، اپنی انتہائی شدت کے ساتھ سامنے آنی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، دین کے نظام سے مفہوم، یہ ہے کہ زندگی، قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ تھا کہ وہ قوانین کونسے ہیں جن کے نافذ کرنے کا ذریعہ اسلامی حکومت ہے۔ اس سوال کو جواب (بظاہر) بڑا آسان اور واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا کے قوانین کے مراد، اس کی کتاب میں دیئے ہوئے احکام وقوانین ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کتاب کا انداز یہ ہے کہ اس میں کچھ احکام متعین طور پر دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن دیگر امور کے متعلق صرف اصول اور حدود دیئے گئے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام، وہ اُمت خود متعین کرے جو دین کو بحیثیت نظام قائم اور متشکل کرنے کا ذمہ لے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ قوانین ہوں یا اصول، یہ سب ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق کسی فرد یا جماعت حتیٰ کہ ساری اُمت کو بھی نہیں ہوگا۔۔ لیکن ان اصولوں کی روشنی میں مرتب کردہ احکام، حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ ان میں اس قسم کی تبدیلی اسلامی مملکت کرے گی جسے اصطلاح میں خلافت علیٰ منہاجِ نبوت، کہا جاتا ہے۔

## خلافت علیٰ منہاجِ نبوت

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''خلافت علیٰ منہاجِ نبوت'' کی تھوڑی سی وضاحت کردی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے دین کو ایک نظام کی شکل میں قائم کر کے دکھایا۔ اسے قرآنی مملکت کہیئے۔ ظاہر ہے، کہ یہ نظام رسول اللہ ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھا۔ اس نظام کو آگے بھی چلنا تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد، یہی نظام حضور ﷺ کے سچے جانشینوں کے ہاتھوں آگے چلا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس دور کو جس میں یہ قرآنی نظام قائم رہا، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت، کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح نبوت حضور ﷺ کی ذات پر ختم ہوگئی، اسی طرح یہ خلافت، خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس کا دوبارہ قیام ممکن نہیں۔

یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت، نام ہے قرآن کریم کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا۔ چونکہ قرآن کریم ہمارے پاس ہر وقت موجود ہے، اس لئے اس کے مطابق نظام ہر زمانے میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کا جو سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، اُسے دوبارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو مملکت بھی قرآن کے

مطابق نظام قائم کرے گی اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جائے گا۔اس حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا، کہ قرآنی اصولوں کے جو جزئی قوانین، کسی سابقہ دور میں مرتب ہوئے تھے، ان کا جائزہ لے، ان میں سے جوقوانین زمانے کی ضرورتوں کو پورا کریں، انہیں علیٰ حالہ رہنے دے۔جن میں کسی ترمیم وتنسیخ کی ضرورت ہوان میں مناسب ترمیم وتنسیخ کردے۔جہاں نئے قوانین کی ضرورت ہو، وہاں نئے قوانین مرتب اور نافذ کرے۔اسی کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔جس کا عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔لیکن (اسے پھر دہرا دیا جائے کہ) اس طرح قانون سازی کا حق یعنی حق اجتہاد صرف خلافت علیٰ منہاجِ نبوت (یعنی قرآنی حکومت) کو ہوگا۔کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کونہیں ہوگا۔لیکن جب تک ایسی حکومت قائم نہ ہو، اُس وقت تک اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں جو جزئیات کسی زمانے میں متعین ہوئی تھیں اور جن پر امت کے مختلف فرقے کار بند چلے آ رہے ہیں ان پر اسی طرح عمل ہوتا رہے۔کسی فرد یا گروہ کا یہ سمجھ لینا کہ اسے ان جزئیات میں تغیروتبدل کا، یا نئی جزئیات مرتب کرنے کا حق حاصل ہے، امت میں انتشار پیدا کرنے کا موجب ہے، جس کی میں شدت سے مخالفت کرتا ہوں۔یہی وجہ ہے کہ میں فرقہ اہل قرآن یا ایسے افراد کا بھی مخالف ہوں جو کبھی تین نمازوں اور نو روزوں کا پرچار کرتے ہیں اور کبھی اردو زبان میں نماز پڑھنے کی اختراع کرتے ہیں۔البتہ ہمارے مروجہ عقاید اور عمل میں جو بات مجھے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف نظر آتی ہے میں اس کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں اور ایسا کرتا رہتا ہوں۔

یہ ہے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام مرتب کرنے کا وہ طریقہ جسے میں قرآن اور سیرت نبی اکرم ﷺ کے مطالعہ سے صحیح سمجھتا ہوں۔اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔خلافتِ راشدہ میں قانون سازی کا یہی اصول تھا۔۔حضرت عمرؓ نے کئی ایسے فیصلوں میں تبدیلی کی جوان سے پہلے عہدِ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زمانہ نبی اکرم ﷺ میں نفاذ پذیر ہوئے تھے۔علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات (کے چھٹے خطبہ) میں بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ امام اعظم (ابوحنیفہؒ) اور شاہ ولی اللہ کا یہی مسلک تھا۔ہمارے زمانے کے اکثر علماء (مثلاً مولانا عبیداللہ سندھیؒ) نے اس کی تائید کی ہے۔خود میری مخالفت کرنے والوں میں ایسے حضرات موجود ہیں، جو اسی خیال کے مؤید ہیں۔لیکن ہمارے عام قدامت پرست طبقہ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام پہلے سے مرتب ہو چکے ہیں، اور اسلامی حکومت کا فریضہ صرف ان احکام کو نافذ کرنا ہے۔وہ ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں کرسکتی۔ایک گروہ کے نزدیک یہ احکام، کتب احادیث میں مجتمع ہیں اور دوسرے گروہ کے نزدیک ائمہ فقہ کی کتابوں کے اندر۔تغیر وتبدل نہ اُن میں ہوسکتا ہے نہ ان میں۔ان میں سے بعض نے اب اتنا کہنا شروع کردیا ہے کہ جن امور کے متعلق کتب احادیث یا فقہ میں کوئی حکم نہ ملے، ان کے متعلق نئے احکام مرتب کئے جاسکتے ہیں۔لیکن ان احکام کی ترتیب وتدوین علماء کرام کریں گے، حکومت نہیں۔حکومت اگر کوئی قانون بنانا چاہے تو جب تک اسے علماء کی طرف سے سند حاصل نہ ہوجائے اسے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔جو لوگ اس بات کو ان الفاظ میں نہیں کہتے، اس مطالبہ کو وہ بھی بڑی شدومد سے

پیش کرتے ہیں کہ پرسنل لاز (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام) بالضرور علما کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔حکومت کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ چنانچہ عائلی قوانین (فیملی لاز) کی مخالفت اسی نظریہ کے ماتحت کی جا رہی ہے۔

## جماعت اسلامی

اگرچہ ان نظریات ومطالبات میں سے ہر نظریہ ومطالبہ، خلافت علی منہاجِ نبوت میں طریقِ قانون سازی کے اصول کے خلاف ہے جس میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی الگ گروہ ہوتا ہی نہیں تھا۔--۔ یہ گروہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب دین، مذہب اور سیاست کے دو الگ الگ گوشوں میں بٹ گیا تھا۔لیکن ان میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض بلکہ خطرناک موقف جماعتِ اسلامی کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہے۔ باقی گروہوں میں اتنی بات مسلم اور واضح ہے کہ احکامِ شریعت پہلے سے موجود ہیں اور ان احکام کی فہرست یہ ہے۔ ان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ سنتِ رسول ﷺ اور ائمہ فقہ، دونوں کے متبعین کا یہی مسلک ہے۔لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ

(1) حکومت کو ازخود قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔

(2) پاکستان میں جملہ قوانین، کتاب وسنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

(3) سنت کا تعین یا جن احادیث سے سنت متعین کی جائے گی، ان کے صحیح اور ضعیف قرار دینے کا کام ازسرِنو کیا جائے گا۔ اس کے لئے کوئی خارجی اصول یا معیار نہیں ہوگا۔ مزاج شناس رسول کی نگہِ بصیرت غلط اور صحیح کا معیار ہوگی۔ حتیٰ کہ جن امور میں کوئی حکم پہلے سے موجود نہیں، اس کے متعلق بھی وہی کہہ سکے گا کہ ایسے مقام پر رسول اللہ ﷺ کیا حکم دیتے۔ اس لئے اس کے حکم کو رسول اللہ ﷺ کا حکم سمجھا جائے گا۔

(4) اور جماعت اسلامی کے اکابرین کے بیانات کے مطابق، یہ مزاج شناس رسول ﷺ خود مودودی صاحب ہیں۔

اس سلسلہ میں خود مودودی صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ احادیث کے متعلق وہ اپنی کتاب ''رسائل ومسائل'' میں لکھتے ہیں:

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند

کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (صفحہ:290)

سنت کی حجت اگر دلیل نہیں تو پھر حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا معیار کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔

> جس نے حدیث کے ذخیرے کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔...... اس مقام پر پہنچ کر وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔...... وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں۔ آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں...... یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں وہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی ﷺ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔
>
> (تفہیمات' حصہ اوّل' صفحہ:302 وصفحہ:324، شائع کردہ محرم 1359ھ)

یعنی پہلے یہ، مزاج شناس رسول، تمام سابقہ معیاروں کو بالائے طاق رکھ کر، اپنی نگہء بصیرت سے اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ احادیث کے مجموعوں میں سے کون کون سی حدیث قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اس کی نگاہ اس کا بھی فیصلہ کرے گی کہ ان احادیث میں سے کن احادیث سے مرتب کردہ سنت کو فی الوقعہ سنتِ رسول کہا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کا ارشاد ہے۔

> سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے...... بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا سنت بنانا مقصود نہیں تھا...... (اسی طرح) جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں، انہیں سنت بنا دینا، اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز منشاء نہیں تھا۔ یہ دین میں تحریف [1] ہے۔
>
> (رسائل ومسائل صفحات 300؛308؛311؛314؛317)

---

[1] واضح رہے کہ حدیث کی کتابوں میں یہ نہیں لکھا ہوتا کہ فلاں فلاں امور حضور ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے سرانجام دیئے تھے یا وہ حضور ﷺ کے شخصی مزاج کے مطابق اختیار کردہ تھے۔ یا ان امور کو حضور ﷺ نے عادۃً اختیار کیا تھا۔ یہ تمیز وتفریق بھی مزاج شناسِ رسول ﷺ ہی کرے گا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جس سنت کو ملک کا قانون قرار دیا جائے گا۔ اس کا تعین یکسر مزاج شناسِ رسول ﷺ کی مرضی پر موقوف ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ تھیا کریسی کی کس قدر آمرانہ، اور مستبدانہ شکل ہوگی۔ جس میں تمام قوانین ایک شخص کے فیصلوں کے مطابق وضع ہوں گے اور ان قوانین کا اتباع ''خدا اور رسول کے فیصلوں'' کی حیثیت سے کرایا جائے گا۔ جن کی خلاف ورزی دنیا اور آخرت میں سخت ترین سزا کی مستوجب، اور جن سے انکار، ارتداد ہوگا جس کی سزا موت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی کتاب (مرتد کی سزا) میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں جب نظام شریعت قائم ہوگا تو یہاں کے مسلمانوں کو ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا کہ وہ اپنے عقاید و مسالک اس اسلام کے مطابق کر لیں جسے یہ صحیح قرار دیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کریں گے انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ مودودی صاحب وہی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جو عیسائیت میں کلیسا (یعنی چرچ) نے اختیار کر رکھی تھی اور جس کی رو سے ہر معاملہ کا آخری فیصلہ پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ چرچ اینڈ اسٹیٹ (کلیسا اور حکومت) کی اس کشمکش نے کیا قیامت برپا کی تھی، اس پر یورپ کی تاریخ کے خونی اوراق شاہد ہیں۔ صدیوں کی مسلسل تباہیوں کے بعد وہاں مفاہمت کی شکل یوں پیدا کی گئی کہ حکومت سیکولر ہوگی اور مذہب کا کام چرچ تک محدود رہے گا۔ یعنی مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے قرار پا گئے۔ جماعت اسلامی اس بدنصیب ملک کو اس مقام پر لیجانا چاہتی ہے جہاں سے یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی یہ کشمکش شروع ہوئی تھی۔ اگر یہ جماعت تقویت پکڑتی گئی تو خطرہ ہے جو کچھ یورپ میں ہوا تھا وہی کچھ یہاں ہو کر رہے گا۔ میں اسے اسلام اور پاکستان دونوں کے لئے تباہی کا موجب سمجھتا ہوں۔ میری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ملک کو ان تباہیوں سے بچا لیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا ''برادران عزیز! کہ قانون سازی کے سلسلہ میں یہاں مذہب اور دین کی کشمکش کس شدت سے جاری ہے۔ میری پکار یہ ہے کہ قانون سازی کے لئے وہ طریق اختیار کیا جائے جسے خود قرآن کریم نے تجویز کیا ہے اور جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں، یعنی جن احکام و قوانین کو قرآن کریم نے متعین شکل میں دے دیا ہے انہیں اسی طرح نافذ کیا جائے اور جن امور کو اس نے اصولی حیثیت سے بیان کیا ہے ان کی جزئیات، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی حکومت، امت کے باہمی مشورہ سے متعین کرے۔ ایسا کرنے سے ان جزئیات کو بھی جو پہلے کبھی متعین ہوئی تھیں، یقیناً پیش نظر رکھا جائے گا۔ وہ قانون سازی کے سلسلہ میں نظائر کا کام دیں گی۔

## حضور ﷺ کی سیرت طیبہ

احادیث کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کی بلندیٔ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کو نوعِ انسان کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قرار دیا ہے۔اس نے حضور ﷺ کی سیرت کے نمایاں خط وخال کو اپنے دامن میں محفوظ کرلیا ہے۔لیکن جزئی واقعات، کتبِ احادیث وتاریخ (سیر) میں پائے جاتے ہیں۔ان کتابوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی باتیں آ گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایسے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں، جن سے حضور ﷺ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہوکر سامنے آتی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم نے جماعت صحابہؓ کی بڑی تعریف کی ہے اور مہاجرین وانصار کے متعلق تو بالتخصیص کہا ہے کہ وہ مومنِ حقا (پکے اور سچے مومن) تھے لیکن ہماری کتب تاریخ میں ان کے متعلق بھی ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان پر بڑا طعن ملتا ہے۔

میری دعوت یہ ہے کہ ان کتب احادیث وتواریخ پر اس انداز سے نظر ثانی کی جائے کہ ان میں سے تمام قابل اعتراض مواد خارج کر دیا جائے۔تاکہ حضور ﷺ کی سیرت اور صحابہؓ کی زندگی اپنی صحیح اور پاکیزہ شکل میں دنیا کے سامنے آئے۔ لیکن یہ کام بھی اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے۔اگر اسے انفرادی طور پر کیا جائے گا تو افراد کا تعصب یا عقیدت صحیح منزل تک پہنچنے کے راستے میں حائل ہوجائے گی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت، ان کتابوں کو جو انسانوں ہی کی مرتب کردہ ہیں -- وحیِ آسمانی کی طرح تنقید سے بالا قرار دیتی ہے۔وہ اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا کوئی گوشہ (معاذ اللہ) داغدار ہوجائے، یا صحابہ کبارؓ کی زندگی قابلِ اعتراض شکل میں سامنے آئے۔لیکن وہ اسے نہیں برداشت کرسکتی کہ ان کتابوں کے مصنفین یا مؤلفین کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ ان سے کوئی غلطی یا سہو ہوا ہے۔دیکھئے! اسلاف پرستی انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے؟ لیکن مذہب کی تو بنیاد ہی اسلاف پرستی پر ہے۔

## اسلامی مملکت سے مقصود کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مذہب کی رو سے دنیا اور آخرت میں ثنویت ہوتی ہے۔اور ایک مذہب پرست انسان کی تمام تگ وتاز کا ماحصل اور سعی وکاوش کا منتہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی عاقبت سنور جائے۔اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کی

اس دنیا کی زندگی کس قسم کی گزر رہی ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک خدا کے مقرب بندوں کی نشانی نہ ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی نہایت عسرت اور افلاس میں گزرے۔۔ جو یہاں جس قدر ذلیل ہوگا وہ وہاں اسی قدر واجب التکریم ہوگا۔ ان کے نزدیک اسلامی مملکت سے مقصد اتنا ہی ہے کہ وہ چور کے ہاتھ کاٹ دے، زانی کو سنگسار کردے۔ شرابی کے کوڑے لگائے، زکاۃ کا روپیہ اکٹھا کرکے، مذہبی تعلیم اور تبلیغ کے کاموں پر صرف کرے، حج کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے وقس علی ذلک۔

لیکن قرآن کریم کی رُو سے اسلامی مملکت کے قیام کا منتہی کچھ اور ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزائیں دی جائیں گی اور احکام اسلامی کی پابندی ضروری ہوگی۔ لیکن یہ تمام امور ذریعہ ہوں گے ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا۔۔ اور وہ مقصد یہ ہے، کہ یہاں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار اس طرح جاری و ساری ہوں جس طرح فضا میں صاف اور خوشگوار ہوا رواں دواں رہتی ہے، کہ ہر متنفس اس سے بلا کاوش و مشقت سامانِ زیست حاصل کرتا رہتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق معاشرہ کے متشکل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جنت کی جن نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر کیا ہے، وہ اس دنیا میں ہر فردِ معاشرہ کو از خود ملتی چلی جاتی رہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس کی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی رہتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی جنتِ اخروی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جس معاشرہ میں خدا کی مستقل اقدار جاری و ساری نہ ہوں، اس میں افراد معاشرہ کی یہ زندگی بھی جہنم کی زندگی ہوتی ہے اور مرنے کے بعد بھی وہ جہنم ہی میں رہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا مقصد، افراد معاشرہ کو اس دنیا اور اگلی دنیا، دونوں میں، جنت کی زندگی عطا کرنا ہے۔ لہٰذا، اس بات کے پرکھنے کا معیار کہ جو حکومت کسی جگہ قائم ہے وہ اسلامی ہے یا نہیں، یہ ہے کہ اس میں افرادِ مملکت کو وہ سامانِ زیست میسر ہے یا نہیں جسے نعمائے جنت کہہ کر پکارا گیا ہے اور انہیں اپنی ذات کی نشوونما کے مواقع حاصل ہیں یا نہیں، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمیں آخرت میں جنت ملے گی یا نہیں، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری یہاں کی زندگی جنت کی زندگی کے مشابہ ہے یا نہیں۔۔ یاد رکھئے! قرآن کریم کی رُو سے، ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ، اس دنیا اور آخرت، دونوں میں جنت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)

جو یہاں کا اندھا ہی وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔ دنیا، آخرت کی کھیتی ہی نہیں بلکہ وہ آخرت کے پرکھنے کی کسوٹی بھی ہے۔

# معاشرتی خرابیاں

ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ جہاں دو آدمی ملیں گے وہ معاشرتی خرابیوں کا رونا روئیں گے-- بلکہ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ روتے روتے آنسو ہی خشک ہو گئے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ (غالب کے الفاظ میں)___ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں___ یہ خرابیاں اس قدر عام، اور معاشرہ کا معروف چلن بن گئی ہیں، کہ ان پر رونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ ان پر بطور فیشن، منبر اور اسٹیج دونوں سے آنسو ضرور بہائے جاتے ہیں۔ منبر سے یہ آواز عادۃً صبح و شام دہرائی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اس لئے ان میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتایا جاتا کہ مسلمانوں نے کیا چھوڑا ہے جس کا فطری نتیجہ یہ خرابیاں ہیں، اور وہ کیا کریں جس سے یہ خرابیاں فی الواقعہ دور ہو جائیں۔

یہی کیفیت اسٹیج کی ہے۔ وہ وزیر ہو یا امیر، صنعت کار ہو یا زمیندار، مستقل لیڈر ہو یا ہنگامی مقرر___ کوئی تقریب ہو یا کسی قسم کا اجتماع___ تان یہاں ٹوٹے گی کہ مسلمانو! تم اپنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھال لو۔ تمہارے سارے کام سنور جائیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتائے گا کہ وہ سانچہ ہے کیا جس میں ڈھلنے سے یہ خرابیاں رفع ہو جائیں گی۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ خرابیاں غلط نظامِ زندگی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ (یا یوں کہئے کہ وہ غلط نظام کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں) اور افراد بالعموم اُن سے ملوث ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نظام نہیں بدلا جاتا، معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں، نہ ہی ان خرابیوں کی یہ صورت ہے کہ کسی ایک شعبہ کو لے کر اس کی خرابیوں کی اصلاح شروع کر دی جائے۔ اس سے اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔ جہنم سارے کا سارا جہنم ہوتا ہے۔ اس کے کسی ایک گوشے کو آپ جنت میں بدل نہیں سکتے۔ چیچک کا علاج الگ الگ آبلوں پر مرہم لگانے سے نہیں ہو سکتا۔ پورے جسم کے خون کو زہریلے جراثیم سے پاک کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے غلط نظام کی پیدا کردہ خرابیوں کا علاج اسی صورت میں ممکن ہے، کہ اسے صحیح نظام سے بدلا جائے۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114) خدا کا بتایا ہوا طریق علاج ہے۔ یعنی سیئات کے دور کرنے کا طریق یہ ہے کہ انہیں حسنات سے بدل دیا جائے۔ حسنات صحیح معاشرہ کے کاروبار کا نام ہے۔ صحیح معاشرہ میں، افراد کی چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصانات ان کے حسنِ عمل کے عالمگیر نتائج سے ڈھک جاتے ہیں۔ (53:32) لہٰذا، جب تک ہم اپنے موجودہ غلط نظام معاشرت، نظامِ معیشت، نظام سیاست وغیرہ کو قرآنی نظام سے نہیں بدلیں گے، معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہو سکیں گی۔ صحیح قرآنی نظام میں، صوم و صلوٰۃ اور حج اور زکوٰۃ سب اپنے اپنے خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں۔ غلط نظام میں یہ محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں۔ اور جب ان کا کوئی زندہ نتیجہ سامنے نہیں آتا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلایا جاتا ہے، کہ ان سے ثواب ہوتا ہے، جو آخرت

میں ہماری نجات کا ذریعہ بنے گا۔

میری دعوت یہ ہے کہ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظامِ زندگی قائم کیا جائے تا کہ معاشرہ کی خرابیاں دور ہوں۔ ہمیں دنیا میں خوشگواری اور سرفرازی کی زندگی نصیب ہو اور ہماری عاقبت بھی سنورے۔۔اس دعوت کی مخالفت ہر اس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے۔۔خواہ وہ مذہب پرستوں کا ہو یا دنیا داروں کا۔۔ جو غیر قرآنی معاشرہ میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔اور قرآنی معاشرہ میں انہیں اپنا وجود خطرہ میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تمام مخالفت میں، میں کسی سے ذاتی طور پر قطعاً نہیں الجھتا۔ میری مخالفت بھی اصول کے لئے ہوتی ہے اور موافقت بھی اصول کی خاطر۔اس تگ وتاز میں، میں ذاتیات کو درمیان میں لاتا ہی نہیں۔۔قرآن کریم جب لا الہ کہہ کر دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار کی نفی کرتا ہے، تو اس سے اس کا مقصود کسی سے ذاتی مخاصمت یا نفرت نہیں ہوتا۔ وہ ہر اُس اصولی نظریہ یا نظام کی مخالفت کرتا ہے جس میں قوانین خداوندی کے علاوہ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کیا جائے۔۔ملوکیت، سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت سے میری مخالفت اسی لا الہ کے اصول کی متابعت کی وجہ سے ہے تا کہ اس انکار سے الا اللہ کے مثبت مقام تک قوم کو لے جایا جا سکے۔

## انقلابی آواز

یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہو گی۔۔ جو شخص لوگوں کے سامنے اُن کے مروجہ عقاید اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے، پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔اُسے، ان کا مسلمہ لیڈر، راہ نمائے شریعت یا مرشدِ طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔لیکن جو شخص ان کے غلط عقاید اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے، انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے، وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی۔اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا، اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اس کا قائد بن جانا، میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی، کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر، قرآن کی آواز پر لبیک کہوں۔اور اس طرح دنیا جہاں کی مخالفت مول لے لوں۔ میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے، سوچتے سمجھتے کیا، اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پر خار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے، تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے ❶۔ مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے۔ جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے، مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

یہ تو دین کا خاصہ ہے، کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں۔ اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہیں رہے، تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق، ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد، اگر اُس قوم کے سامنے دین نہ ہو، تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست، مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی، اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو، تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہی، اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہء بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے، وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔۔ یہاں اس وقت جو آپ مذہبی پیشوائیت کا جوش و خروش دیکھ رہے ہیں یہ مذہب کی حرکت مذبوحی اور رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رُخ کرے، یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تا کہ دنیا میں ایک خطہء زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے۔ یہ ہے میرا وہ احساس اور اس کے ماتحت میری یہ آرزو اور ارادہ، جس کی بنا پر، میں دنیا جہان کی مخالفت مول لے کر، مروجہ مذہب کے ایک ایک گوشے کو سامنے لاتا اور اس کی جگہ دینِ خداوندی پیش کئے جا رہا ہوں، اس امید پر کہ

ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہو گی

---

❶ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے کہ خدا کی طرف سے دین عطا ہوتا ہے لیکن اس کے بعد مذہبی پیشوائیت اسے پامال کر کے، مذہب میں تبدیل کر دیتی ہے۔

لہٰذا، میری دعوت اور پیغام کا ملخص (کم از کم) پاکستان میں، انسانوں کے خودساختہ مذہب کی جگہ خدا کے عطا کردہ دین کی حکمرانی کو قائم کرنا ہے۔

جب میں نے پہلے پہل یہ آواز بلند کی تو اپنے آپ کو تنہا پایا--بالکل تنہا--لیکن قرآن کریم کی صداقتوں پر یقینِ محکم نے میری دستگیری کی اور ان جانکاہ تنہائیوں کے باوجود، میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کیا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ؕ کی نوید حیات بخش، مجھے پکارتی ہوئی آگے بڑھاتی چلی گئی--مجلہء طلوع اسلام، لاکھوں کی تعداد میں شائع شدہ پمفلٹ، میری تصانیف، تقاریر، خطبات، مذاکرات، نجی گفتگوئیں، اس فکر کی نشرواشاعت کے ذرائع تھے۔ آہستہ آہستہ یہ فکر فضا میں پھیلتی اور رفتہ رفتہ قلوب سلیم میں اترتی چلی گئی۔ اور ایک ایک، دو دو کر کے، مجھے رفیقِ سفر ملنے شروع ہو گئے۔ جب ان کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی تو بعض رفقاء نے یہ تجویز پیش کی کہ

## طلوع اسلام کی بزمیں

بجائے اس کے کہ ہم انفرادی طور پر اس فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ایک بستی یا شہر کے رہنے والے متفقینِ فکر اجتماعی طور پر اس کی نشرواشاعت کریں۔ تجویز معقول تھی۔ اسے اختیار کر لیا گیا۔ اور یوں طلوع اسلام کی بزموں کا وجود عمل میں آ گیا۔

طلوع اسلام کی بزمیں، نہ سیاسی پارٹیاں ہیں، نہ مذہبی فرقے، نہ ہی انہیں کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی یہ عملی سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ ان بزموں کا مقصد، اس قرآنی فکر کی اجتماعی طور پر نشرواشاعت ہے--انہیں یوں ہی سمجھئے جیسے بزمِ اقبال، جس کا مقصد فکرِ اقبال کی نشرواشاعت ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر صرف فکری انقلاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے پیغام کا اوّلیں مخاطب، قوم کا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ہے۔

اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے نہ کبھی پبلک سے چندہ مانگا ہے نہ قربانی کی کھالیں۔ نہ صدقات و زکوٰۃ کے پیسے جمع کئے ہیں۔ اس کے مرکزی اخراجات پورے کرنے کا بنیادی ذریعہ میری کتابوں کی آمدنی ہے۔ یا کسی ہنگامی ضرورت کے لئے احباب کا تعاون، بزموں کے اراکین اپنی اپنی جگہ اس فکر کی نشرواشاعت کا انتظام خود کرتے ہیں۔ اس تحریک کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ اس قدر عالمگیر مخالفت کے باوجود، کسی مقام پر رُکی نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (57:21)

## میری پوزیشن

اس سلسلہ میں اتنا اور واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری پوزیشن قرآن کریم کے ایک ادنیٰ طالب العلم اور مبلغ کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے قرآن کریم پر غور و فکر کیا ہے اور اسی غور و فکر کے نتیجے کو میں اوروں تک پہنچاتا ہوں۔

اپنی فکر کو نہ میں حرفِ آخر سمجھتا ہوں، نہ سہو وخطا سے منزہ -- جو مجھے میری کسی غلطی سے آگاہ کرے میں اس کا شکر گزار ہوتا ہوں لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ مجھے یہ بتایا جائے کہ میری پیش کردہ فکر کس طرح قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ میرے نزدیک دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ مجھے نہ مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے نہ دوسرے مسلمان بھائیوں سے کسی قسم کی الگ اور ممتاز حیثیت کا زعم --قرآن کریم نے ایمان کے جو اجزائے خمسہ متعین کئے ہیں --یعنی خدا، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت --ان پر میرا ایمان ہے۔ اور ایمان ہے ان تصریحات کے مطابق جنہیں خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اور میری دعوت کی حد آخر یہ ہے کہ وہی نظریہء زندگی، وہی نظامِ حیات مستحقِ حمد وستائش ہوسکتا ہے جو خدا کی صفتِ رب العالمینی کا مظہر ہو۔

## تعلیمی اسکیم

خدا کی اس صفتِ رب العالمینی کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے --بالفاظ دیگر اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام زندگی متشکل کرنے کے لئے --پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام اور اس تصور کو اجاگر کیا جائے۔ اس وقت تک میں نے یہی کیا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم وتربیت اس انداز سے کریں کہ اس نظام خداوندی کا قیام، ان کے جذبات کا تقاضا، ان کی آرزوؤں کا مرکز، ان کی کوششوں کا محور، اور ان کی زندگی کا مقصد بن کر ان

### ہمارا نظام تعلیم

کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے --بدقسمتی سے ہمارا موجودہ نظام تعلیم بڑا ناقص اور ہماری اُبھرنے والی نسلوں کے لئے سمِ قاتل ہے۔ میں نے اس اٹھارہ برس میں، قوم کی توجہ اس اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی، لیکن دیکھا یہ کہ قوم کو سرِ دست کسی سنجیدہ معاملہ کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں۔ اس نے زیادہ سے زیادہ کیا تو اتنا کہ اسکولوں اور کالجوں میں، اسلامیات کے پیریڈ کا اضافہ کر دیا۔ یا اسے ایم اے میں ایک مضمون کی حیثیت دیدی۔ اس ''اسلامیات'' نے نوجوان طالب علموں کو اور بھی مذہب گزیدہ بنا دیا۔ پہلے اگر وہ دین سے بیگانہ تھے تو اب وہ اس سے متنفر ہو گئے۔ اور اس کے بعد، یکسر سرکش -- یہ ہیں وہ نوجوان جو اس وقت قوم کے لئے ایک مسئلہ (پرابلم) بن رہے ہیں -- (حالانکہ یہ پرابلم خود قوم ہی کی پیدا کردہ ہے) یہی ہیں وہ نوجوان جو آئندہ چل کر خود ایک قوم بن جائیں گے۔

ان حالات میں، میں نے سوچا کہ اگر مروجہ نظام ونصاب تعلیم کو ملک گیر حیثیت سے بدلنا میرے بس میں نہیں، تو کم از کم، میں ایک ایسی درسگاہ (کالج) کے قیام کی کوشش کروں جس میں صحیح قرآنی تصورات کے مطابق تعلیم وتربیت کا انتظام ہو، جس

میں طریقہء تعلیم یہ ہو کہ طالب علم طبعیات پڑھیں یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ -- وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا --غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبہ سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل میں کس طرح ممدو معاون ہوسکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا ہے۔

یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ --فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحیء خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعت عامہ کے لئے صرف کیا جائے -- بالفاظ دیگر، اس تعلیم و تربیت کے ذریعے طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں پختگی، اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ جب تک اس انداز کی اپنی یونیورسٹی قائم نہ ہو، اس کالج میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدے کے مطابق دی جائے تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم زندگی کے کسی شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے -- یاد رکھئے -- میں اپنی قوم کے نوجوانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں! -- ان میں بڑی صلاحیتیں ہیں، لیکن یہ ہماری غلط تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی یہ صلاحیتیں، صحیح اقدار کے ساحلوں کے اندر رہ کر، جوئے حیات بخش بننے کی بجائے، حدود آشنا سیلابِ بے پناہ بن جاتی ہیں جس کا نتیجہ تباہیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی صلاحیتوں کو انسانیت ساز اقدار کا پابند بنا دیا جائے تو آپ دیکھئے کہ یہی نوجوان، کس طرح تقدیرِ ملت کے درخشندہ ستارے نہیں بن جاتے!

میرے پیش نظر کالج کا مقصود یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی عمر کے اس آخری حصہ میں، اپنی قوم کے بچوں اور بچیوں کو لے کر بیٹھ جاؤں، اور کم از کم، آنے والی نسلوں کے لئے ایک طیب اور صالح خمیر تیار کر جاؤں —— وَمَا تَوْفِيقِيٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ —— اس مقصد کے لئے ''قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی'' کے نام سے ایک سوسائٹی بنا لی گئی ہے جسے حکومت کے ہاں سے رجسٹرڈ کرا لیا گیا ہے۔ 25 بی۔ گلبرگ (لاہور) اس سوسائٹی کا دفتر ہے اور محترم مرزا محمد خلیل صاحب اس کے خزانچی جن کے نام پر عطیہ جات موصول ہوتے ہیں -- اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط چھپ چکے ہیں۔ اور اس اسکیم میں دلچسپی لینے والے حضرات، انہیں سوسائٹی کے دفتر سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں دیئے جانے والے عطیات کو، سنٹرل گورنمنٹ نے، انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ قرار دیدیا ہے۔ یہ سوسائٹی، ادارہ، طلوع اسلام سے الگ ہے اور اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا حساب کتاب بھی الگ ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! میرے سامنے (یوں کہیے کہ) میری زندگی کا آخری نصب العین۔ لیکن اس کا حصول، ظاہر ہے کہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میں ان تمام احباب سے جو میری قرآنی فکر سے متفق ہیں اور اس درسگاہ کی اسکیم کو مفید

خیال کرتے ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے اس سوسائٹی سے تعاون کریں۔ اگر آپ احباب کی رفاقت سے یہ درسگاہ قائم ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ یہ، ہمارے تعلیمی نظام میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے مثال کا کام دے گی۔ اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل جائے گا۔ اور اس میں حصہ لینے والوں کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ جس طرح سے سرسید کا دارالعلوم، تشکیل پاکستان پر منتج ہوا، چہ عجب کہ یہ درسگاہ پاکستان کو ایک صحیح اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے کا موجب بن جائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز۔۔! میرا آخری پیغام

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

## 20 مارچ، 3 بجے بعد دوپہر

## آخری کھلا اجلاس

ٹھیک تین بجے بعد دوپہر کنوینشن کا یہ آخری اجلاس شروع ہوا، تو پنڈال کی حاضری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مفکرِ قرآن کے خطاب کا موضوع تھا۔۔ ''خدا کی مرضی'' ۔۔ ہر معاملہ اور ہر بات میں ''خدا کی مرضی'' کے الفاظ قدم قدم پر سننے میں آتے ہیں، لیکن ''خدا کی مرضی'' ہے کیا؟ اس پر علی وجہ البصیرت شاید ہی کبھی کسی نے غور کیا ہو۔۔ ''خدا کی مرضی'' ۔۔ (تقدیر کا مسئلہ) بجائے خود ایسا موضوع تھا جس کی حقیقت کشائی کے لئے ہر شخص بے تاب دکھائی دیتا تھا۔ لاہور کے اہل علم وفکر طبقہ کی خاصی تعداد جوق در جوق شریک اجلاس ہوئی تھی۔ اور جب پرویزؔ صاحب نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی تو پورا پنڈال گوش برآواز تھا۔ اس اہم خطاب کا آغاز انہوں نے اپنے مخصوص دلنشین (بلکہ محاکاتی) انداز میں کیا۔ انہوں نے مائی بھولی کے اکلوتے نورنظر کی جوانی کی موت، شاہمد بدمعاش کے ہاں دولت کی فراوانی اور جاہ وحشم، نادرہ کی خانہ ویرانی کی روزمرہ کی داستانوں سے ''خدا کی مرضی'' کا مروجہ مفہوم واضح کیا اور اس مرضی کے سامنے انسان کی مجبوری اور بے بسی پر ''ارباب شریعت کی مہر تصدیق'' سے ''خدا کی مرضی'' کا ناگزیر تسلط وجہ جواز کے طور پر ذہن انسانی پر مرتسم کیا جاتا ہے اور پھر ایک ایک کرکے ان آیات کے حقیقی مفہوم کو علی وجہ البصیرت نمایاں کیا۔

مفکرِ قرآن ذہنِ انسانی کی ان غلط اندیشیوں کے پردے چاک کرتے ہوئے آگے بڑھے اور قرآنی تعلیم کا وہ نقطہء ماسکہ پیش کیا جو قانونِ مکافاتِ عمل کی حیثیت سے انسانی زندگی کے فیصلوں کا سرچشمہ قرار پایا ہے۔ یعنی اعمالِ انسانی کا ہر نتیجہ

کسی دھاندلی یالا اُبالیت سے نہیں بلکہ خدا کے مقررہ قوانین کی رُو سے سرانجام پاتا ہےاور افراد واقوام کی قسمتوں کے فیصلے کسی ادنیٰ رورعایت یا زیادتی کے بغیر انہی قوانین کے مطابق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ اس مقام پر انہوں نے اس وضاحت کی ضرورت محسوس کہ، کہ تقدیر الٰہی کے اس گمراہ کن تصور نے اُمت کے عقاید میں کیونکر سازشِ عجم کے ہاتھوں راہ پائی۔ اور ہمارے ہاں کی ملوکیت نے اپنی ذاتی مفاد پرستیوں کی خاطر اسے کس عیاری اور مکاری سے عوام کے ذہنوں میں راسخ کر کے افیون کے ٹیکے کی طرح انہیں صدیوں کی گہری نیند سلا دیا۔اور اپنے ظلم واستبداد کی کارفرمائیوں کو تقدیر خداوندی کے اٹل فیصلے قرار دے کر اندیشہ ہائے دورودراز سے فارغ ہوگئے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں اس کے المناک انجام کو سامنے لاتے ہوئے ان کی یہ درد بھری آواز فضا میں گونجی کہ

''تن بتقدیر'' ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

یعنی جس قوم کی نگاہوں سے کبھی زمانے کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں وہ صدیوں سے اپنی تقدیر کا رونا روتی چلی آ رہی ہے۔ان کا یہ اہم خطاب ایک دعوتِ انقلاب کی صورت میں تقدیر کے اس قرآنی مفہوم پر ختم ہوا کہ

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ — خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں!

خطاب ختم ہوا تو حاضرین انکشافِ حقیقت کے ایک نئے اور نورافشاں ماحول میں کھڑے تھے۔قرآن کے ایک عظیم طالب علم نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے وہ تمام پردے چاک کر دیئے تھے جو تقدیر کے پُرفریب مفہوم کو قلب ونگاہ پر مسلط کر کے صدیوں سے انسانی قوتِ عمل کو مفلوج کئے چلے آرہے تھے۔

اس نشست کے بعد کنونشن کا آخری اجلاس منعقد ہوا جس کے آخر میں پرویزؔ صاحب نے حسب معمول اپنے رفقاء سے الوداعی خطاب فرمایا۔

یہ خطاب ختم ہوا تو نکھرے ہوئے آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔رات شروع ہو چکی تھی اور سالانہ کنونشن کا آخری مرحلہ حُسن وخوبی سے تکمیل پا چکا تھا۔

فالحمد للہ علیٰ ذٰلک

۞۞۞۞۞

| | |
|---|---|
| نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے | امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں |
| نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر | تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں |

خورشید انور، فتحپور سوات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# قرآنی انقلاب کا راستہ

"آغاز افراد کی ذہنی و اخلاقی تبدیلی سے ہوتا ہے، اور یہی تبدیلی آگے چل کر ایک صالح معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔"

**انقلاب کی ابتدا اپنے آپ سے ہوتی ہے:**

تاریخِ انسانی اس حقیقت کی شاہد ہے کہ کوئی بھی پائیدار انقلاب محض نعروں، جذباتی خطابت یا سیاسی قوت کے بل پر برپا نہیں ہوا۔ ہر حقیقی انقلاب کی بنیاد انسان کے باطن میں رکھی گئی، جہاں فکر بدلتی ہے، اقدار تبدیل ہوتی ہیں، ترجیحات نیا رخ اختیار کرتی ہیں اور شخصیت ایک نئے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جب افراد بدلتے ہیں تو خاندان بدلتے ہیں، خاندان بدلتے ہیں تو معاشرے تبدیل ہوتے ہیں، اور جب معاشرہ بدلتا ہے تو تاریخ ایک نئے موڑ پر آ کھڑی ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم بھی اسی ابدی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ ۔۔۔ (13:11)

اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی اندرونی کیفیت کو تبدیل نہ کرے۔

یہ قرآن کے اجتماعی فلسفۂ انقلاب کی بنیادی آیت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ نہیں کہ کسی قوم کی تقدیر محض دعاؤں، تمناؤں یا جذبات سے بدل جائے۔ تبدیلی کا آغاز انسان کے اپنے نفس، اپنی فکر، اپنے کردار اور اپنی اجتماعی روش کے بدلنے سے ہوتا ہے۔

اسی حقیقت کو سورۂ الانفال میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۙ (8:53)

یعنی اللہ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں اس وقت تک واپس نہیں لیتا جب تک وہ خود اپنی ذہنیت، اپنے اخلاق اور اپنے اجتماعی کردار کو فساد کی طرف نہ لے جائے۔

یہ آیت قوموں کے عروج و زوال کا قرآنی قانون بیان کرتی ہے۔ قومیں باہر سے نہیں ٹوٹتیں، وہ پہلے اندر سے بکھرتی ہیں۔ جب ذاتی مفاد اجتماعی مفاد پر غالب آ جائے، اصولوں کی جگہ شخصیات لے لیں، اخلاص کی جگہ مفادات آ جائیں اور

مقصد کی جگہ عہدے عزیز ہو جائیں، تو زوال کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو قوم مسلسل اپنا احتساب کرتی ہے، اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتی رہتی ہے، اپنے نظام کو قوانینِ الٰہی کے مطابق ڈھالتی رہتی ہے، وہ ترقی کے سفر پر گامزن رہتی ہے۔

## انقلاب کا پہلا مرحلہ: انسان سازی:

رسولِ اکرم ﷺ پر جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو آپ ﷺ کو نہ حکومت قائم کرنے کا حکم دیا گیا، نہ فوج منظم کرنے کا، نہ سیاسی تحریک شروع کرنے کا۔ سب سے پہلے ایک ایسے انسان کی تعمیر کی گئی جو خود قرآن کا مجسم نمونہ بن سکے، اور پھر اس کے ذریعے ایسے انسان تیار کیے گئے جو اس پیغام کے عملی پیکر ہوں۔

اسی لیے سورۂ مزمل کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا گیا۔

یہ دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ ایک عظیم انقلاب کے لیے سب سے پہلے ایسے رفقائے کار تیار کرنا ضروری ہیں جو مقصد، فکر، کردار اور اخلاص میں ایک جان ہوں۔

تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرہ برس میں سب سے پہلے انسان تیار کیے۔ یہی وہ سرمایہ تھا جس نے بعد میں دنیا کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

## تعداد نہیں، کردار فیصلہ کرتا ہے

قرآنی انقلاب کبھی بھی محض اکثریت کے بل پر برپا نہیں ہوا۔

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابتدا میں چند ہی افراد تھے، لیکن وہ ایمان، اخلاص، استقامت، ایثار اور نظم وضبط کا ایسا شاہکار تھے کہ وقت نے ثابت کیا کہ معیار، تعداد سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

آج بھی اگر قرآن کے غلبے کی جدوجہد کرنے والے افراد اپنی تعداد بڑھانے سے پہلے اپنے کردار کی تعمیر پر توجہ دیں تو نتائج یقیناً مختلف ہوں گے۔

## تعلیم، حکمت اور تزکیہ

قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129)

رسول اللہ ﷺ صرف قرآن پڑھ کر نہیں سنا دیتے تھے بلکہ قرآن کی حکمت سمجھاتے، اس کے عملی تقاضے واضح کرتے اور پھر ایسی تربیت فرماتے کہ افراد کی شخصیت ہی بدل جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو کل تک قبائلی تعصب، انتقام، خودغرضی اور جاہلیت کی علامت تھے، چند برسوں میں رحم، عدل، دیانت، ایثار اور انسان دوستی کی مثال بن گئے۔

قرآن کی تعلیم اگر کردار نہ بدلے تو وہ محض معلومات رہ جاتی ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم انسان کو بدل دیتی تھی۔

## رفقائے کار کی اصل پہچان

سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ ہر دور کی قرآنی جماعت کا معیار ہے۔

وہ باطل کے سامنے فولاد کی طرح مضبوط ہوتے ہیں، لیکن آپس میں سراپا رحمت ہوتے ہیں۔

ان کی طاقت باہمی محبت میں ہوتی ہے۔

ان کی عبادت انہیں معاشرے سے فرار نہیں سکھاتی بلکہ ذمہ داری کا شعور عطا کرتی ہے۔

ان کی زندگی کا ہر عمل اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

وہ اپنی ذات کی نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح کے لیے جیتے ہیں۔

قرآن انہیں ایک ایسے بیج سے تشبیہ دیتا ہے جو آہستہ آہستہ مضبوط درخت بن جاتا ہے۔ یہی ہر قرآنی تحریک کا فطری سفر ہے۔ ابتدا ہمیشہ خاموش ہوتی ہے، لیکن اگر بنیاد صحیح ہو تو انجام ایک تناور درخت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

## ایک لمحۂ احتساب

یہاں ہر داعیٔ قرآن کو رک کر اپنے آپ سے چند سوال کرنے چاہئیں۔

کیا میرے اندر قرآن کی مطلوبہ استقامت موجود ہے؟

کیا میں ذاتی رنجشوں سے بلند ہو چکا ہوں؟

کیا میں اپنے بھائی کی کامیابی پر خوش ہوتا ہوں؟

کیا میں دوسروں کی خدمت کو اپنی خواہشات پر ترجیح دے سکتا ہوں؟

کیا میں اختلاف کے باوجود ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کی عملی تصویر ہوں؟

اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں تو ہمیں دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے، کیونکہ قرآنی انقلاب کا آغاز ہمیشہ اپنے نفس کے انقلاب سے ہوتا ہے۔

جب ایک فرد بدلتا ہے تو وہ ایک چراغ بنتا ہے، جب چند چراغ اکٹھے ہوتے ہیں تو قافلہ بنتا ہے، اور جب ایسے قافلے وجود میں آتے ہیں تو تاریخ انہیں انقلاب کے نام سے یاد کرتی ہے۔

## انقلاب کا معمار کیسا ہوتا ہے؟

رسولِ اکرم ﷺ کو جب منصبِ رسالت عطا ہوا تو آپ ﷺ کے سامنے صرف چند افراد کی اصلاح یا ایک محدود مذہبی جماعت کی تشکیل کا ہدف نہیں تھا، بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک ایسے نظامِ حیات کا قیام مقصود تھا جس میں انسان، انسان کا محکوم نہ رہے بلکہ صرف اللہ کے قانون کا پابند ہو۔

اسی مقصد کی طرف سورۂ مزمل میں رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (73:9)

یہ اعلان دراصل اس عالمگیر انقلاب کا منشور تھا جس کے نتیجے میں ہر غیر اللہ کی حاکمیت ختم ہو اور انسان صرف قوانینِ الٰہی کے تابع زندگی گزارے۔ رسول اللہ ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ اسی قانون پر کامل اعتماد کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھیے، کیونکہ یہی راستہ بالآخر انسانیت کی نجات کا راستہ ہے۔

لیکن اس عظیم مقصد کے لیے سب سے پہلے ایسے افراد درکار تھے جو خود قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ ہوں۔

جماعت پہلے بنتی ہے، انقلاب بعد میں آتا ہے

تاریخ کا یہ ناقابلِ تردید اصول ہے کہ ہر عظیم انقلاب سے پہلے ایک عظیم جماعت وجود میں آتی ہے۔ نظریات کتابوں میں رہ کر معاشرے نہیں بدلتے، بلکہ وہ اس وقت تاریخ بناتے ہیں جب چند مخلص انسان انہیں اپنی زندگیوں میں مجسم کر دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی کیا۔ آپ ﷺ نے پہلے ایمان، اخلاص، نظم، ایثار اور استقامت رکھنے والے افراد تیار کیے۔ یہی وہ جماعت تھی جس کے بارے میں سورۂ فتح میں فرمایا گیا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29)

قرآن ان رفقائے کار کی چند بنیادی صفات بیان کرتا ہے۔

وہ باطل کے سامنے غیر متزلزل ہوتے ہیں۔

وہ آپس میں سراپا رحمت ہوتے ہیں۔

وہ اقتدار کے طلبگار نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔

وہ مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔

اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو اللہ کے قانون کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے۔

یہی وہ صفات ہیں جو ہر دور کی جماعتِ مومنین کا معیار ہیں۔

**انقلاب کا سب سے بڑا دشمن**

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی تحریک کا سب سے بڑا دشمن بیرونی مخالفت ہوتی ہے، لیکن قرآن اس سے بھی بڑے خطرے کی نشاندہی کرتا ہے، اور وہ ہے جماعت کے اندر خود غرضی، انا، باہمی رقابت اور ذاتی مفاد۔

اسی لیے قرآن نے فرمایا: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9)

وہ اپنی ضرورت پر بھی دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ صرف ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ قرآنی انقلاب کی بنیادی شرط ہے۔

جس جماعت کے افراد اپنی ذات سے بلند نہ ہو سکیں، وہ کبھی انسانیت کی قیادت نہیں کر سکتی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں ایثار کا یہ معیار اس حد تک تھا کہ شدید پیاس کی حالت میں بھی ایک دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیتے رہے۔ یہی وہ کردار تھا جس نے انہیں دنیا کا امام بنایا۔

## استقامت۔۔۔انقلاب کی روح

قرآنی انقلاب وقتی جوش کا نام نہیں۔

یہ برسوں کی محنت، مسلسل تربیت، آزمائشوں اور قربانیوں کا دوسرا نام ہے۔

اسی لیے قرآن اعلان کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾ (46:13)

ایمان صرف زبان سے اعلان کا نام نہیں، بلکہ اس اعلان پر پوری زندگی ثابت قدم رہنے کا نام ہے۔

استقامت ہی وہ قوت ہے جو مخالف حالات کو بھی کامیابی کی سیڑھی بنا دیتی ہے۔

## مخالفتیں راستہ نہیں روک سکتیں

ہر داعیِ حق کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو بھی جھٹلایا گیا، تمسخر کا نشانہ بنایا گیا، معاشی بائیکاٹ کیا گیا، ظلم و ستم کیے گئے، لیکن قرآن نے فرمایا:

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ﴿١٠﴾ (73:10)

یعنی مخالفین کی باتوں سے دل شکستہ نہ ہو، بلکہ وقار، صبر اور حکمت کے ساتھ اپنے مشن پر قائم رہ۔

قرآنی تحریک کا کارکن ردِ عمل کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی توانائی مخالفین کے جواب میں نہیں بلکہ اپنے کردار کی تعمیر اور اپنے مشن کی تکمیل میں صرف کرتا ہے۔

## آزمائش انقلاب کا لازمی مرحلہ ہے

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا نظام قائم کرنا آسان راستہ ہے، قرآن ان کی اصلاح کرتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت 214 واضح کرتی ہے کہ سابقہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو شدید آزمائشوں، مصیبتوں اور زلزلہ خیز حالات سے گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بظاہر ہر طرف مایوسی دکھائی دینے لگی، لیکن اسی مرحلے پر اللہ کی نصرت قریب آ گئی۔

گویا آزمائش ناکامی کی علامت نہیں بلکہ کامیابی کی تمہید ہوتی ہے۔

جس طرح بیج کو مٹی کے اندر دبنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر وہ تناور درخت بنتا ہے، اسی طرح انقلابی جماعتوں کو بھی صبر، قربانی اور استقامت کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

## آج ہمارا فرض

یہ سوال آج ہر وابستہ فرد کے سامنے کھڑا ہے۔

کیا ہم قرآن کے غلبے کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن اپنی اصلاح کے لیے تیار نہیں؟

کیا ہم انقلاب چاہتے ہیں، لیکن ایثار نہیں؟

کیا ہم اتحاد کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن اپنی انا چھوڑنے پر آمادہ نہیں؟

کیا ہم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی کامیابیاں چاہتے ہیں، لیکن ان جیسی قربانیاں دینے کے لیے تیار نہیں؟

اگر ایسا ہے تو ہمیں اپنی ترجیحات پر دوبارہ غور کرنا ہوگا۔

قرآنی انقلاب کسی ایک فرد کا منصوبہ نہیں، بلکہ ایسی جماعت کی اجتماعی جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے جو اللہ کے قانون پر غیر متزلزل ایمان رکھتی ہو، باہمی محبت میں ایک جسم کی مانند ہو، اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر صرف انسانیت کی فلاح کو اپنا مقصد بنا لے۔

ایسی ہی جماعت کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی، بلکہ ایک دن اس کا ننھا سا بیج ایک تناور شجر بن کر پوری انسانیت کو سایہ فراہم کرے گا۔

## پہلے ہم بدلیں، پھر دنیا بدلے گی

قرآنِ حکیم نے رسولِ اکرم ﷺ کو جس عظیم منصب کے لیے منتخب فرمایا، وہ صرف چند افراد کی اصلاح یا کسی محدود مذہبی جماعت کی تشکیل نہ تھی، بلکہ پوری انسانیت کو ظلم، استحصال، طبقاتی تقسیم اور انسان کی انسان پر حاکمیت سے نجات دلا کر ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنا تھا جہاں صرف اللہ کے قانون کی بالادستی ہو۔

اسی عظیم ذمہ داری کی طرف سورۂ مدثر کے ابتدائی الفاظ اشارہ کرتے ہیں: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنذِرْ ﴿٢﴾ (74:1-2)

گویا اے وہ ہستی جس کے سپرد انسانیت کی تعمیرِ نو کا عظیم فریضہ ہے! اٹھیے، اور دنیا کو اس انجام سے آگاہ کیجیے جو باطل نظاموں کا مقدر ہے، اور اسے اس راستے کی دعوت دیجیے جو فلاح، عدل، امن اور انسانی عظمت کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

یہ دعوت کسی خاص قوم، نسل یا خطے کے لیے نہیں تھی بلکہ پوری نوعِ انسان کے لیے تھی۔ اسی لیے قرآن نے اعلان کروایا:

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۚ (10:108)

یہ خطاب ''اے مسلمانو!'' سے نہیں بلکہ ''اے انسانو!'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کا پیغام عالمگیر ہے اور اس کا انقلاب پوری انسانیت کے لیے رحمت ہے۔

## انقلاب کا راستہ جبر نہیں، دعوت ہے

رسولِ اکرم ﷺ کو کبھی یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ لوگوں کو قوت کے ذریعے قرآن قبول کرائیں۔ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے:

وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾ (10:108)

اور دوسری جگہ فرمایا: وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ (6:107)

یعنی آپ لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے کہ انہیں زبردستی ایک راستے پر چلائیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی انقلاب کا راستہ شعور، دلیل، کردار، محبت اور دعوت کا راستہ ہے، نہ کہ جبر، نفرت اور انتقام کا۔

لوگوں کے دل فتح کیے جاتے ہیں، جسم نہیں۔

ضمیر بیدار کیے جاتے ہیں، غلام نہیں بنائے جاتے۔

آج ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر ایک اہم سوال ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

اگر ہم واقعی قرآن کے غلبے کے داعی ہیں تو کیا ہم نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جو رسولِ اکرم ﷺ نے اختیار فرمایا تھا؟

کیا ہم نے پہلے اپنے اندر قرآن کو زندہ کیا؟

کیا ہماری جماعت میں وہ باہمی محبت، ایثار، نظم وضبط، برداشت اور اخلاص موجود ہے جسے قرآن نے ''رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ'' کے الفاظ میں بیان کیا؟

کیا ہم اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی عزت، خیر خواہی اور تعاون کو قائم رکھتے ہیں؟

کیا ہمارے فیصلوں میں شخصیت غالب ہے یا قرآن؟

کیا ہماری گفتگو میں اخلاص زیادہ ہے یا انا؟

کیا ہماری جدوجہد کا مرکز اللہ کا دین ہے یا اپنی رائے کی برتری؟

یہ سوالات دوسروں سے پہلے ہمیں اپنے آپ سے پوچھنے چاہئیں۔

انقلاب نعروں سے نہیں، کردار سے آتا ہے

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مکہ میں تیرہ برس تک انسان تیار کیے۔ ان میں قرآن کا شعور پیدا کیا، ان کی شخصیتوں کو سنوارا، ان کے دلوں سے خود غرضی، تعصب، حسد اور جاہلیت کو نکالا، اور ان کی جگہ اخوت، ایثار، عدل، دیانت اور استقامت پیدا کی۔

پھر یہی لوگ مدینہ میں ایک ایسے معاشرے کی بنیاد بنے جس نے دنیا کو پہلی مرتبہ یہ دکھایا کہ قرآن محض پڑھنے کی کتاب نہیں بلکہ ایک زندہ نظامِ حیات ہے۔

آج بھی اگر ہم یہی راستہ اختیار کریں تو حالات بدل سکتے ہیں، لیکن اگر ہم کردار سازی کے بغیر صرف انقلاب کے نعرے بلند کریں تو یہ خواہش کبھی حقیقت کا روپ اختیار نہیں کر سکے گی۔

## اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت

آج ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم صرف یہ دیکھیں کہ دوسروں میں کیا کمزوریاں ہیں، بلکہ اس بات کی ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہم خود اس معیار پر کہاں کھڑے ہیں جس کا مطالبہ قرآن کرتا ہے۔

اگر میں رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ نہیں ہوں تو مجھے دوسروں سے محبت کا مطالبہ کرنے کا کیا حق ہے؟

اگر میں ایثار سے خالی ہوں تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثالیں بیان کرنے سے کیا حاصل؟

اگر میں نظم وضبط کا پابند نہیں تو جماعتی استحکام کیسے پیدا ہوگا؟

اگر میں اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کرسکتا تو وحدت کیسے قائم ہوگی؟

اگر میری ترجیح اپنی ذات ہے تو پھر قرآنی انقلاب کی جدوجہد صرف ایک نعرہ رہ جائے گی۔

## امید کی کرن

اس کے باوجود مایوسی کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کا وعدہ آج بھی قائم ہے۔

جب بھی کوئی جماعت خلوصِ نیت کے ساتھ قرآن کو اپنی فکر، کردار، اجتماعی زندگی اور نظامِ حیات کا مرکز بنا لے گی، اور رسولِ اکرم ﷺ کے طریقِ کار کے مطابق افراد سازی، تعلیم، تربیت، تزکیہ، تنظیم اور استقامت کے مراحل طے کرے گی، اللہ تعالیٰ کے قوانینِ نصرت اس کے حق میں حرکت میں آجائیں گے۔

یہی وہ جماعت ہوگی جو انسانیت کو خوف سے امن، ظلم سے عدل، نفرت سے اخوت، استحصال سے مساوات اور انتشار سے وحدت کی طرف لے جائے گی۔

## ہماری دعوت

آیئے، ہم دوسروں کے احتساب سے پہلے اپنا احتساب کریں۔

ہم دوسروں کو بدلنے سے پہلے خود بدلیں۔

ہم قرآن کو صرف پڑھنے کی نہیں بلکہ اپنی شخصیت، اپنے گھر، اپنی تنظیم اور اپنے معاشرے میں نافذ کرنے کی کتاب بنائیں۔

ہم ایسی جماعت بننے کی کوشش کریں جسے دیکھ کر قرآن کی یہ شہادت زندہ ہوجائے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (48:29)

اگر ہم اس معیار تک پہنچنے کی سچی کوشش کریں گے تو قرآنی انقلاب کا سفر ہمارے اپنے دل سے شروع ہوگا، پھر ہمارے کردار میں ظاہر ہوگا، پھر ہماری جماعت میں، پھر ہمارے معاشرے میں، اور بالآخر پوری انسانیت تک اس کی روشنی پہنچے گی۔

یہی رسولِ اکرم ﷺ کا طریقِ انقلاب تھا، یہی قرآن کا راستہ ہے، اور یہی ہر اس جماعت کا راستہ ہونا چاہیے جو اللہ کے دین کی سربلندی اور انسانیت کی فلاح کی داعی ہے۔

وَ مَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۷﴾ (36:17)

**Muhammad Sarim, Karachi**

# SALAH

Before we begin on the essential concept of Islam that is the system of Salah, we should understand why it is necessary to discuss a topic which is already so well studied and supposedly commonly understood. One would naturally assume that if Muslims are truly implementing the system of Salah correctly, the result of that implementation should be as the Qur'an states too. That is:

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵

***Recite that which has been revealed to you of the Book and keep up Salah; surely Salah keeps (one) away from indecency and evil, and certainly the remembrance of Allah is the greatest, and Allah knows what you do. (29:45)***

It is clearly stated that if one is to keep up with Salah, they would stay away from indecency and evil (the word " اِنَّ", or surely, only emphasizes this fact). However, if we observe the Muslim world, we see that let alone the people who offer prayers, even the people who lead the prayers are not removed from these kinds of acts. In the above verse Allah has explained a clear cause and effect, if one should uphold the system of Salah, they will "keep away from indecency and evil". Due to the effect not being visible one concludes that it is because the cause is not there. Either Salah is not being offered, which we know is not true as Muslims all around the world diligently offer Salah, or the current understanding of Salah we have is flawed.

Let us look into a different interpretation of what the system of Salah is.

The root of this word is “ ص ل و” or "Sd-L-W". In classical Arabic, it describes a second horse in a race running so closely behind the lead horse that its head stays aligned with the leader's body, although it never moves ahead of the leader either. The runner up horse is called اَلْمُصَلِّی or "al-musalli. This verse of the Quran further explains this point:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ...

***Surely my Lord is on the right path. - Surah Hud (11:56)***

This shows we are meant to follow Allah and keep close to him, his laws and the path he has set for us, as he himself is on that path. Who better would know how to realize the potentialities of your nafs (which is the goal of a Muslim) than the one with the perfect nafs. This can be made even clearer by the following verse:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا

***But there came after them an evil generation, who neglected the system of salat and pursued their own gains and desires. They will find themselves facing utter destruction. (19:59)***

The Quran uses a literary tool where it explains the meaning of a word or phrase by using another phrase that means the opposite or an antonym. This is one of those situations. It is stated that those who strive for only their own personal benefit will surely only lead themselves to ruin. This coincides with our previous point that we will only truly be successful when we follow the path Allah has laid out for us in the Quran.
Allah has also laid out a condition for establishing the system of Salah:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

***Those who, should We bestow upon them the authority to rule and they do come into power, will establish the system of salat and pay the poor-rate and enjoin good and forbid evil... (22:41)***

It is very clear that Salah can only be established once there is a sovereign state for Muslims. One cannot truly call themselves a ***Musalli*** unless they are situated in a separate state which operates within the laws and regulations Allah has placed upon us. There is a couplet written by Allama Iqbal on this very concept:

مُلّا کو جو ہے ہِند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

***Just because the Mullah in India is permitted to perform his prostrations (sajdah), The fool imagines that Islam itself is free!***

This makes sense too, as the Quran provides a system which is only possible when Muslims are in power, so that they may enforce the decrees of Allah. The next question that arises is what the system of Salah actually looks like. The Quran answers this beautifully

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَ مِ ۙ

***And the earth (land) He has created for the benefit of all living beings (55:10).***

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَا ِشَ وَ ۡ لَّسْ ُمْ لَهٗ ِ ۡزِقِيْنَ

***And We have provided therein (in the land) sustenance for you, and for those for whom you do not provide (15:20)***

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ؕ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۖ وَالْجِبَالَ اَرْسٰ هَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ

***And after that He spread the earth and brought forth from it its water and its pasture. And mountains He firmly set. (All this He did) as a provision for you and your cattle (79:30-33)***

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ ِ لَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ ۡ مَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ.ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ .وَجَعَلَ فِیْهَا
رَوَاسِیَ ِ فَوْقِهَا وَ ٰكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَ مٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ

***Say thou: Do ye indeed believe not in Him Who created the earth in two long ages and ascribe ye unto Him rivals? He (and none else) is the Nourisher of the universe. And He placed therein stable mountains above it and blessed it, and measured therein its foods in four periods (seasons of the year), alike for those who stand in need of it (41:9-10)***

These verses make it obvious that Allah is saying the resources are for mankind and whosever needs these resources should be able to take advantage of them freely. Hence, for one to own the means of production and hoard resources is a seemingly un-Islamic concept. The means of production should be owned by the state, and they should be the ones that are responsible for providing it's citizens the basic necessities:

نَحۡنُ َ ُزُقُكُمۡ وَاِ ّ هُمۡ ج

***We will provide for you and your children (6:151)***

Not only that an individual should work hard and earn and produce as much as possible, keep that is basically and essentially necessary for his own upkeep and of those for whom he is personally responsible, and give away the rest for meting out the necessities of others in need, as is ordained in the Qur'an:

وَ َسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ لا

***And they ask thee as to what should they give (for the benefit of others). Say: "Whatever is surplus to your own requirements" (2:219),***

and in this their attitude should be such as to declare:

لَا ُ ِ يۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا

***We desire from you neither reward nor thanks (76:9).***

To sum it up, the system of Salah is a system where they follow the principle:

وَ ِعَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

***and Allah's is the end of affairs. (22:41)***

The Quran has already laid down the foundations upon which human civilization can flourish, still some may ask, why not be more specific. Why not talk about specific economic policies, bureaucratic systems, etc. Well, the answer to that is quite simple. It is impossible to declare specific policies as something that is to be followed for all of time. There will always be changes in the economics, politics and cultures of the world, so to set 1 specific policy for all times would ignore the nuances and intricacies of the problems that modern civilization faces. The Quran gives a set of permanent values upon which to build the foundation of a successful, efficient, and productive civilization, however what to build on that foundation, should be decided by people of that time. More specifically the Quran says:

وَاَمْرُهُمْ شُوْر ٰى بَيْنَهُمْ

***...their rule is to take counsel among themselves... (42:38)***

As long as a civilization operates inside the sphere of permanent values provided by Allah, the ultimate nafs, and decisions are made by rational individuals, an Islamic society creates an environment where every individual will have the opportunity to develop their own nafs in an optimal way. So where did this concept of Salah or Namaz that we see today come from? At Rasoolallah's time masjid-e-Nabawi was a center for important events where meetings were held and issues were discussed. Before the meeting was held 2 rakaats were offered as a symbol. Even in those rakaats اِهْدِ َ الصِّرَ ٰاطَ الْمُسْ َقِيْمَ is said, as the believers are asking that in this decision too, they should be guided to the path Allah has laid down for them. We see now that "namaz" was just a small part of Salah and was seen as more of a symbol to bring the intangible concept of salah into a tangible practice. This point is only further clarified in the Quran:

قَالُوْا شُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ مُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰ ؤُ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا شٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ

***They said to Shu'aib: "When you had asked us not to interfere in your obedience to Allah, We had thought that it meant only your worship of Allah. Now we see that it goes beyond that. Your Sal'at does not allow us to adhere to the religion of our ancestors, no to use our wealth as we like. You act as though our ancestors were ignorant and you alone possess reason, and that you have a monopoly over sympathy for the poor people. (11:87)***

تَدْعُوْا اَدْ وَ لّٰى ۙ وَجَمَعَ فَاَوْ

***17. It is not far off. It is summoning back everyone who had turned away from the Divine System and had sought avenues of escape.***
***18. In other words he does not keep his wealth freely available for public welfare, but amasses and hoards it by filling his coffers and blocking all its outlets (70:17-18)***

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِ هُمْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِ هُمْ آءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۧ

***4. In order to show himself to be a religious person, he offers a lot of prayers. For such people prayers become a source of self-deception because they are deceiving themselves (and others) that they are the virtuous.***
***5-6. They, in fact, are oblivious to the concept of Salat. The objective of Salat is to establish a society in which everyone follows Divine Laws, and every human being continues to receive nourishment. People are oblivious to its objective and their consequential responsibilities; and after performing visible rites, they believe they have fulfilled the duties assigned by the Almighty***
***7. The outcome of such self-deception is that while on the one hand they do offer prayers, on the other they take total control of the sources of nourishment. These, however, should remain open and available, like ever-flowing springs, for all needy people. They are thus depriving the needy of the sources of nourishment (and thus belying Deen). (107:4-7)***

ینگ پینل: نمرہ، نعیمہ، یمنیٰ، محمد احمد

سینئر پینل: سلیم اختر، آصف جلیل، ڈاکٹر نیلم نوید، آمنہ لطیف، ڈاکٹر صالحہ نغمی

شکیل مغل

محمد عمر

حمزہ

حاضرینِ مجلس کا ایک منظر

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.79
ISSUE
09

# Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org